قیدی

شوکت بک ڈپو

Nankana Sahib.

قیدی
اور
دیگر افسانے

مجبوب عالم قصوری

پبلشرز
شوکت بک ڈپو گنپت روڈ۔ لاہور

باراول　　　　۱۹۴۷ء　　　　قیمت ۸؍

فہرس

دنیا ایک قید خانہ ہے جس میں ہر ذی حس قیدی ہے۔
زندگی کی قید۔ سماج کی قید۔ اخلاق کی قید۔ خواہشات کی قید
دنیا میں انسان کبھی ان قیدوں سے آزاد نہیں ہو سکتا ——
اِدھر دنیا ہے اُدھر دین ہے۔ دنیا کی طرف جھکے تو دین سے محروم
ہوتا ہے۔ دین کی طرف متوجہ ہو تو دنیا سے ہاتھ دھوتا ہے۔۔
.... انسان ازلی اور ابدی قیدی ہے اور پھر بھی اپنے آپ کو
آزاد کہتا ہے۔

ایک قیدی کی سرگذشت بیان کی گئی ہے۔ گوشۂ زنداں
جس کا دائمی ٹھکانا بن چکا ہے۔ پڑھیے کیوں اور کیسے؟.....
پھر سوچیے کہ اُس کی ذمہ داریاں کس کس پر عاید ہوتی ہیں۔ قیدی
اس میں خود کہاں تک ذمہ دار ہے اور گردش دہر کا اس میں
کس قدر ہاتھ ہے۔ جیلر نے کیا دیکھا۔ کیا سوچا اور کیا سُنا؟.....
.... پڑھیے اس کی ڈائری۔

قیدی

(جیلر کی ڈائری کے چند اوراق)

اُس کے بہت سے بال سفید ہو چکے تھے۔ جھریاں پڑے ہوئے چہرے پر اُس کی بھوری آنکھیں خوفناک حد تک چمکتی تھیں۔ وہ آہنی زنجیروں میں جکڑا ہوا ارد گرد کے آدمیوں کو لاپرواہی سے گھور رہا تھا۔ آہنی زنجیریں زنگ آلود سلاخیں۔ چمکتی ہوئی سنگینیں اور آنے جانے والے وارڈوں کے بھیانک چہرے اُس کے لئے کوئی معنی نہ رکھتے تھے۔

وہ اپنے ماحول سے بالکل بے نیاز تھا۔ وہ خود کو اُتنا ہی آزاد سمجھتا تھا جتنا کہ عام زندگی میں کوئی اپنے آپ کو خیال کرتا ہو۔ اُس کی شخصیت عام سطح سے کچھ غیر متوسط معلوم ہوتی تھی۔ میری

اُنگلیوں میں جنبش ہوئی اور میں اُس کے کاغذات اُلٹ پلٹ کرنے لگا ــــ اُس کے شباب کا سنہری زمانہ اور باقی عمر کا بہترین حصّہ سنگین چار دیواری میں ضائع ہو چکا تھا۔ اُس کے کانوں نے چودہ بار حکّام کے گرجتے ہوئے فیصلے سُنے۔ لیکن اُس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ مہیب سے مہیب تر ہوتا گیا حتّٰی کہ جیل کی چار دیواری اُس کا دائمی ٹھکانہ بن کر رہ گئی۔

معاً میرے دل میں کچھ خیال پیدا ہوا۔ وہ بھی آخر انسان ہے۔ اُس کے سینے میں بھی دل ہے۔ کیا وہ یہ نہیں چاہتا کہ وہ بھی کبھی آزادی کی فضا میں سانس لے۔ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ قید خانے کی چار دیواری سے وہ مانوس ہو چکا ہو؟

کیا دنیا میں ایسے انسان بھی ہیں جو آزاد زندگی کی نسبت گوشۂ زندان میں زیادہ خوش رہ سکتے ہوں؟ یہ جانتے اور سمجھتے ہوئے کہ یہ فعل ضرور اُس چار دیواری تک پہنچا کر رہے گا۔ بار بار اُسی فعل کو دوہرائیں اور وہی ڈرامہ جو اس سے پیشتر اُن سے کھیلا جا چکا ہو پہلے سے زیادہ شد و مد سے اُن سے کھیلا جائے۔ اور یہ اپنے آپ کو تماشائی سمجھتے ہوئے دل میں خیال تک نہ لائیں؟ آخر ایسا کیوں؟

میں انہی خیالات میں محو تھا کہ کسی ہلکی سی آواز نے مجھے چونکا دیا —— ایسی آواز جو کسی ٹوٹے ہوئے بربط کے تاروں کو چھیڑنے سے نکلتی ہے۔ قیدی ہمارے نئے سپرنٹنڈنٹ صاحب سے مخاطب تھا۔

"اور کوئی بہن بھائی تو تھا ہی نہیں میری ہی زندگی کا خیال تھا۔ جو آخر وقت تک اس پر مسلط رہا۔

میرا بچہ! میرے بچے کا کیا ہو گا؟ اُسے اب کون سنبھالے گا۔ میرا نازو نعم سے پلا ہوا بچہ۔ آج تک کسی نے میلی آنکھ سے اُسے نہ دیکھا۔ میرے بعد نہ جانے کیا ہو گا؟ کس کس سے اسے واسطہ پڑے گا۔ بیشک باپ موجود ہے لیکن ماں آخر ماں ہوتی ہے۔ ماں کی ممتا کا کون مقابلہ کرے گا؟

میرے باپ نے اُسے تسلی دی کہ میں اپنی عمر کا باقی حصہ اُسی کی بہتری کے لئے وقف کردوں گا۔ اور اُس نے کہا کہ اُس کی امیدوں کا سہارا اور آنکھوں کا تارا بھی تو میں ہی ہوں۔ لیکن ماں آخر ماں تھی۔ روتی جاتی تھی اور کہتی تھی مجھے کیسے قرار آئے۔ سب اُسے تسلی دیتے رہے اور تھوڑی دیر بعد وہ مجھے ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر سدھار گئی۔

سایۂ مادر سے محرومی

کسی چیز کو کھو کر انسان اُس کی قدر پاتا ہے۔ میری ماں بڑی اچھی تھی۔ اُس کے مرنے کے بعد اُس کی جدائی کو میں نے بہت بری طرح محسوس کیا۔ باپ بہتیرا پیار دلاسا دیتا چھوٹی سی تو میری عمر تھی۔ مجھے وہ اُنگلی سے لگا کر بازار میں لے جاتا۔ طرح طرح کی مٹھائیاں اور کھلونے مجھے لے کر دیتا لیکن میرا دل نہ بہلتا تھا۔ میرا دل متلاشی تھا اُس راحت کا جو ماں کی آغوش میں ملا کرتی ہے۔ لیکن قدرت کے زبردست ہاتھوں نے اُسے مجھ سے چھین لیا تھا۔ مجھ سے ظلم کیا گیا تھا۔ ..... بہت ظلم —— ایک معصوم دل کی دنیا کو اُجاڑ کر رکھ دینا آخر ظلم نہیں تو اور کیا ہے؟ میں رات کو سوتے میں ماں ماں کہتا ہوا چلّا اٹھتا۔ میرے لئے یہ صدمہ ناقابلِ برداشت تھا۔

میرا باپ اُسے بخوبی محسوس کر رہا تھا۔ اکثر دوستوں سے اس کا ذکر بھی آتا۔ کسی شریف آدمی نے انہیں مشورہ دیا کہ دوسری بیوی گھر لے آؤ تو شاید اس کے پیار محبّت سے بچّے کا دل بہل جائے۔ والد صاحب سیدھے سادے سے آدمی تھے۔ اُن کے

دل میں بھی سما گئی۔ اور پھر —— وہی ہؤا جس کی اُمید تھی۔ والد صاحب اس اقرار سے دوسری بیوی لائے تھے کہ وہ میری غور پرداخت بخوبی کرے گی۔ میری "یہ ماں" ایسا کرتی رہی لیکن "اپنی ماں" کا خیال میرے دل سے نہ گیا۔

زندگی کے راستے میں تھوڑی ہی منزل آگے بڑھے تھے کہ ہم تین سے چار ہو گئے۔ اب —— میری ماں حقیقی معنوں میں سوتیلی بننے کی کوشش کرنے لگی۔ اسے خیال آیا جائیداد کا اور اس کے حصہ داروں کا۔ —— اسے اپنے بچے کی فکر تھی —— وہ بھی آخر ماں تھی۔ اس بچے کی اس کی بھلائی و بہبودی ہر جائز و ناجائز طریقہ سے اس کے پیشِ نظر تھی۔ انسانی ہمدردی کو بالائے طاق رکھتے ہوئے وہ بھولنے لگی کہ میں بھی ایک معصوم بچہ ہوں کسی ماں کا —— کسی اُجڑے مزار کی شمع........ میری ہر حرکت اُس کی نظروں میں خار کی طرح کھٹکنے لگی۔

میرے بھولے پن کو بے وقوفی کا نام دے دیا گیا۔ اور ناز و ادا کو شرارت کہا جانے لگا۔ دنیا میں کوئی نہیں تھا جو میرے ناز اُٹھاتا۔ باپ بھی روز روز کے جھگڑوں اور تقاضوں

سے تنگ آچکا تھا۔ خیر سے اب دوسرا بچہ بھی تھا۔ بیوی کے خیال سے اس نے بھی میری طرف توجہ کم کردی۔ یہاں تک کہ مجھے ایسا معلوم ہونے لگا کہ گھر کی دیواریں مجھے کاٹنے کو دوڑتی ہیں۔ اس دوران میں کسی کو میری تعلیم و تربیت کا خیال نہ آیا اور نہ ہی کسی نے اس کی پرواکی۔ نہ کسی کو میرے کھانے کی فکر تھی نہ پہننے کی ——

بُروں کی صحبت

میں محلّہ کے شریر لڑکوں کے ساتھ باغ میں جایا کرتا اور ہم وہاں سے پھل وغیرہ توڑ لایا کرتے۔ کبھی کبھی کسی خوانچہ والے کے چنے اُڑا کر ہم قہقہے مارتے ہوئے بھاگ آتے۔ دوسروں کو دکھ دینے میں ہمیں بہت لطف آتا۔ ہم کیلے کے چھلکے بازار میں اچھی طرح پھیلا دیتے اور جب کوئی شریف آدمی اُس پر سے پھسل کر گرتا اور اُس کے سفید کپڑے کیچڑ سے لت پت ہو جاتے تو ہم خوب تالی بجاتے۔ ان حرکتوں سے ہمیں بہت ہی مزا آتا۔ کوئی نہیں تھا جو ہمیں روکتا۔ ہم دن بدن ایک آفت ہوتے چلے گئے۔ میرے

ساتھیوں کو بھی اُن کے گھر والوں سے کوئی باز پرس نہ تھی ؛

ہم میں سے ایک لڑکا کشنا تھا۔ اُس کی ماں اُسے بہت مارا کرتی تھی کہ ان لڑکوں سے میل جول مت رکھو۔ لیکن وہ بھی اتنا ضدی ثابت ہوا تھا کہ روز شام کو مار کھاتا اور صبح پھر ہم سب آم توڑنے چلے جاتے۔ وہ لڑکا ماں کو کہا کرتا تھا کہ آم لا دیا کرو تو گھر میں ہی بیٹھا رہوں۔ لیکن اُس کی ماں غریب تھی وہ اُسے آم کہاں سے لا کر دیتی۔ کشنا آم کھانے کے لئے ہمارا ساتھی بنا تھا۔ لیکن جب ہم شرارتیں کرتے تو اُسے بھی شریک ہونا پڑتا۔ اُس کی ماں مزدور تھی۔ دن بھر پرائے گھر کی محنت کرتی تو شام کو خشک روٹی میسّر آتی۔ باپ اُس کا تھا نہیں۔ وہ عرصہ سے مر چکا تھا۔ ماں کا اکلوتا بیٹا تھا۔ ماں اُس کی یا تو روٹی کی فکر کرتی یا دن بھر اُس کی نگرانی کرتی ؛

صحبت نے رنگ دکھایا اور وہ ہم سے بھی بہت زیادہ بڑھ گیا۔ ہم جؤا نہیں کھیلتے تھے۔ وہ جؤا بھی کھیلنے لگا۔ لیکن ہم سب سے چھپ کر۔ رفتہ رفتہ وہ بڑی عمر کے بدمعاش آدمیوں میں جا کر بیٹھنے لگا۔ اور اُن کی چلمیں بھرا کرتا۔ وہ اُسے کھانے پینے کے لئے بہت کچھ دیا کرتے —— وہ فخریہ ہمیں اپنی شرارتیں

بیان کیا کرتا اور بہت خوش ہوتا۔ وہ اپنے آپ کو ہم سے بڑا تصوّر کیا کرتا تھا ——

یونہی کسی نگراں کی عدم موجودگی کی پرواہ نہ کرتے ہوئے کسی سایہ شفقت کے بغیر آوارگی کی دھوپ میں میں نے اپنی زندگی کی اوّلیں منازل طے کیں — کئی دفعہ مجھے سکول میں داخل کرنے کی کوشش کی گئی لیکن میں وہاں سے بھاگ آتا۔ سکول کی مقیّد زندگی میری طبیعت کو نہ بھاتی تھی۔ اور زندگی میں دوزخ سمجھتا تھا تو صرف سکول کو —— کون جانتا تھا کل کو کیا ہونے والا ہے ——

تمنّائے رنگ و بُو

بچپن کی شرارتیں اور شوخیاں عمر کے ساتھ ساتھ ہی رنگ بدلتی گئیں۔ وہ دن گذر گئے جب صرف کھانے کھیلنے اور لوگوں کو دق کرنے کا شوق تھا۔ اب دل میں تمنّائے رنگ و بو بھی چُٹکیاں لینے لگی —— میرے بچپن کے ساتھی عیّاش کہلاتے تھے۔ مجھے بھی وہ کبھی کبھی کسی محفل میں لے جاتے۔ میں مفلس عاشق کی طرح حُسن و جوانی کو حریص نگاہوں سے دیکھا کرتا۔ پاس تو پھوٹی کوڑی بھی نہ تھی کہ کوئی تمنّا برآتی ؎

اُن دنوں ہمارے شہر میں تھیٹر آیا۔ شہر والے بہت شوق سے تھیٹر میں جاتے اور پھر میں اُن کی زبان سے اداکاروں کے کام کی تعریفیں سُنتا ایک دن کسی دوست کے ساتھ میں بھی تھیٹر میں چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد ڈرامہ شروع ہوُا۔ اور میں خوب محو ہو کر دیکھنے لگا۔

زنگا رنگ کی سینریوں اور زرق برق لباس کے درمیان میرا دل کھو گیا اور میں قہقہوں اور تالیوں کی فضا میں غرق ہو گیا۔

ہیروئن کا کردار روپا کا تھا اور وہ اُسے خوب نبھا رہی تھی اُس کی ایک ایک ادا میرے جذبات میں طوفان پیدا کرنے کے لئے کافی تھی۔ بہت کچھ ہوتا رہا اور میں دیکھتا رہا۔ جب کھیل کا وہ حصّہ آیا جہاں ہیرو اور ہیروئن نے مل بھاگنے کی ٹھانی تو معًا مجھے خیال آیا۔ کیا ہی اچھّا ہوتا اگر اس پچکے ہوئے گالوں والے ہیرو کی بجائے میں ہوتا۔ میرا جسم مضبوط اور سڈول تھا اور میں نے محسوس کیا کہ اگر تھیٹر کا مالک مجھے اس پارٹ کے لئے منتخب نہ کرے تو بہت سخت غلطی کرے گا۔ کیونکہ میں اُس کے ہیرو سے زیادہ اچھا کردار ادا کر سکتا ہوں۔ میرے دل میں یہی سما گئی اور میں موقعہ کی تلاش کرنے لگا کہ کب وہ وقت آئے جب میں بھی سٹیج پر کھڑے ہو کر

روپا کے ہونٹوں سے ہونٹ ملاؤں - اپنی بہادری اور دلیری کے کارنامے دکھاؤں - لوگ خوش ہو کر تالیوں سے مجھے داد دیں - اور اس ہیرو کی طرح شہر بھر میں میرے ہی کردار کا چرچا ہو +

فریبِ نگاہ

تھیٹر کا مالک ایک پارسی سیٹھ تھا - اس سے میری ملاقات ہوئی - اور ایک معمولی کردار کے لئے مجھے منتخب کر لیا گیا سیٹھ کو میرا کام پسند آیا - اور میری امیدوں کے بالکل مطابق تھوڑے ہی دنوں میں مجھے ہیرو کا کردار دیا گیا +

ریہرسل کے دوران میں جہاں محبت کا ایک سین دکھایا جانا تھا پہلی دفعہ مجھے بتایا گیا کہ معشوقہ سے اس طرح آنکھیں چار کی جاتی ہیں - شام کو جب اصل سبق کا وقت آیا - اور سٹیج پر ہم دونوں تھے - میں اور روپا - تو روپا نے کچھ ایسی محبت بھری نگاہ سے مجھے دیکھا کہ میں دل تھام کر رہ گیا - آج تک مجھے ایسی نگاہ سے واسطہ نہ پڑا تھا ——— میں ذرا سنبھلا اور محسوس کیا کہ میری نظروں کا وار بھی خالی نہ گیا تھا - میں نے خود کو ڈرامے کا باقی حصّہ ادا کرنے کے ناقابل پایا - سب کچھ فراموش ہو چکا تھا -

ہمارے لب خاموش تھے اور آنکھیں مصروف کار۔ مسلسل محویت کا عالم طاری تھا کہ ہجوم کے آوازوں سے ہم چونکے اور گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔ معاملہ بگڑ چکا تھا۔ تماشائیوں نے بہت شور مچایا اور تالیاں اور سیٹیاں بجائیں۔ پردے گرا دئے گئے اور اُس دن کا کھیل ملتوی کر دیا گیا ۔

اُس دن کے بعد مجھے روپا سے کام کرنے کا موقعہ نہ دیا گیا۔ سیٹھ نے تو صاف ہی کہہ دیا تھا کہ ہمیں تمہاری خدمات کی ضرورت نہیں مگر روپا کے اصرار سے مجھے اس رنگین دنیا سے الگ نہ کیا گیا۔ اور مجھے معمولی کردار ملتے رہے۔ روپا کے تصور سے میرا دل بے قرار رہنے لگا۔ اور موقع پا کر میں اس سے ملنے جلنے لگا۔ اس ملنے جلنے نے رنگ دکھایا اور ہم ایک رنگین دنیا کے خواب دیکھنے لگے ۔

روپا بھی میری محبّت میں کھوئی جا رہی تھی۔ اور اُس کو ایک لمحہ بھی بغیر میرے گذارنا محال تھا۔ تھیٹر کے کام میں اس طور پر ہرج ہونے لگا۔ کیونکہ جب ہم میٹھی میٹھی باتیں کیا کرتے تو خواہ کتنا ہی ضروری پروگرام یا ریہرسل ہوتا روپا پرواہ نہ کرتی۔ سیٹھ کو اب فکر ہونے لگی کہ کسی طرح اس کانٹے کو راستے سے

ہٹا دیا جائے - روپا تھیٹر کی جان تھی۔ اور اُس کے بغیر تھیٹر کا جاری رہنا ناممکن - چنانچہ بات بات پر مجھے سیٹھ کی جھڑکیاں اور دھمکیاں سُننا پڑتیں - وہ مجھے اس لئے تنگ کرتا کہ میں تھیٹر چھوڑ کر بھاگ جاؤں - کیونکہ روپا کے ڈر سے وہ صاف طور پر مجھے برطرف نہیں کر سکتا تھا ؛

گرفت اوّلیں

میرے اور روپا کے درمیان جب بندشیں پیدا کر دی گئیں تو ہم نے اپنی علیحدہ دنیا بسانے کا ارادہ کر لیا۔ موتیوں کا وہ بیش قیمت ہار جو سیٹھ نے روپا کو عارضی طور پر دے رکھا تھا۔ روپا نے مجھے دیا کہ اسے مناسب قیمت پر بازار میں بیچ کر کچھ عرصہ کے لئے گذارہ کا بندوبست کر لیا جائے۔ تجویز یہ ٹھہری کہ کسی دوسرے شہر میں جا کر ہار سے حاصل کردہ روپیہ سے معمولی کاروبار شروع کیا جائے۔ اور اسی طرح سے گذر اوقات کی جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا - لیکن شامت اعمال آڑے آئی کہ عین اُس وقت جب کہ ہم سٹیشن پر کھڑے آنے والی گاڑی کا انتظار کر رہے تھے سیٹھ پولیس کو لے کر آدھمکا ؛

مجھ پر ہار کی چوری کا الزام لگایا گیا۔ روپا نے بہتیرا کہا کہ ہار میں نے اسے دیا تھا۔ اس نے چوری نہیں کیا۔ لیکن اس کی چیخ وپکار میری کلائیوں میں پڑتی ہوئی آہنی زنجیروں کی جھنکار میں گُم ہو کر رہ گئی۔ میں یکہ و تنہا رہ گیا۔ بے یار و مددگار۔ اور آخر عدالت نے مجھے مجرم گردانتے ہوئے ایک سال کے لئے گوشۂ زنداں میں پھینک دیا۔

قید خانے کی محدود اور رنجیدہ زندگی سے پہلی بار مجھے پالا پڑا تھا سال بھر میں نے رو رو کر گذارا۔ اور آخر خدا خدا کر کے جب وہاں سے چھٹکارا پایا تو میں نے سچے دل سے توبہ کی کہ آئندہ کوئی ایسی حرکت نہ کروں گا جس سے مجھے یہاں واپس آنا پڑے ؎

"بھائی"

گھر جانا اب لا حاصل تھا۔ دنیا اندھیر نظر آتی تھی۔ میں نے چاروں طرف غور کیا لیکن کوئی ایسا دکھائی نہ دیا جو میرے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھتا۔ قید و بند کی صعوبتیں مجھے نحیف و نزار کر چکی تھیں۔ اوّل میں نے کہیں چھوٹی موٹی ملازمت کی تلاش کی لیکن ناکام رہا۔ اور آخر کسی دوسرے شہر کے سٹیشن پر قلیوں کا کام کرنے لگا ؎

ایک شب رات کی ٹرین سے میں ایک خوش پوش نوجوان

کا سامان اُٹھا کر لا رہا تھا۔ میں نے اُسے غور سے دیکھا تو وہ مہندر تھا۔ مہندر میری دوسری ماں کا بیٹا تھا۔ وہ مجھ سے چھ سال چھوٹا تھا۔ میں نے اُسے پہچان لیا مگر اپنی حالت کو دیکھتے ہوئے خاموش رہا۔ جب میں نے اس کے مکان پر جا کر سامان اُتارا۔ اُس وقت اس نے مجھے غور سے دیکھا اور بھائی کہتے ہوئے مجھ سے لپٹ گیا ✦

"بھائی تم کہاں اور تمہاری یہ حالت؟" اُس کی محبّت کو دیکھتے ہوئے اور اپنی برگشتہ حالت کے خیال سے میری آنکھوں سے بھی آنسو بہ نکلے اور اس کے اصرار پر میں نے اُسے اپنی تمام کہانی سُنا دی۔ اُس نے مجھے وہاں سے جانے نہ دیا۔ میں نے اُسے ایک خوش اخلاق نوجوان پایا۔ اُس نے میری خاطر مدارات میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ اور ہر طرح سے میری دلجوئی کرنے لگا۔ آہستہ آہستہ اُس کی ہمدردی محبّت۔ زندہ دلی اور روشن خیالی کا سکّہ میرے دل پر بیٹھتا گیا اور مجھے اُس کی رفاقت میں ایک روحانی لذّت حاصل ہونے لگی۔ اُس کا کاروبار اچھا تھا۔ میں اُسے بہتیرا کہتا رہا کہ مجھے کسی کام پر لگا دو۔ لیکن وہ ہمیشہ یہی کہہ کر ٹال دیتا رہا کہ بھائی میرے ہوتے ہوئے آپ کو کام کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ حقیقتاً مجھے اب شرم محسوس ہو رہی تھی کہ چھوٹے بھائی کی روٹیاں کب تک بیکار بیٹھ کر اُڑاؤں ✦

میرے اصرار پر اُس نے مجھے اپنے ہی کاروبار میں کارندہ مقرر کر دیا۔ اور میں پوری جانفشانی سے کام کرنے لگا۔ میرے شامل ہونے سے مہندر کو کافی حوصلہ ہو گیا۔ میں دوسرے کارندوں کے کام کی پوری پڑتال اور نگرانی کرنے لگا۔ جس کی وجہ سے کسی کو بے ایمانی کی جرأت بھی نہ پڑتی تھی ؛

ہمارا ایک کارندہ تھا۔ لالو۔ شرابی اور کبابی۔ مہندر جیسے سادہ لوح آدمی کو وہ باتوں ہی باتوں میں اُلّو بنائے رکھتا تھا۔ اور اُس کی بددیانتی سے ہزاروں کا گھاٹا پڑ رہا تھا۔ اُس کی حرکات میں مہندر کو بتاتا رہا۔ حتّٰے کہ ایک دن اُس نے اُسے برطرف کر دیا۔ پہلے تو وہ مہندر کی منّت سماجت کرتا رہا۔ اور کہتا رہا کہ آئندہ کوئی ایسی حرکت نہ کروں گا مگر بھیّا نے ایک نہ مانی۔ اُسی شام وہ شراب پی کر آیا اور بھیّا کو گالیاں دینے لگا۔ یہاں تک کہ اُس سے ہاتھا پائی ہونے لگی۔ اُس پر دوسرے کارندوں نے اُسے خوب پیٹا۔ میں اُس وقت وہاں پر موجود نہ تھا۔ یہ واقعہ بھیّا نے مجھے بعد میں بتایا ؛

نوشتۂ تقدیر

ایک رات جب کہ ہم دونوں ایک ہی کمرے میں سو رہے تھے۔ کھڑ کھڑاہٹ کی آواز سے اچانک میری آنکھ کھلی۔ میں نے دیکھا کہ بیرونی کھڑکی کے راستے سے کوئی شخص ہاتھ میں کھلا ہؤا چاقو لئے داخل ہؤا اور مہندر کی چارپائی کی طرف سرعت سے بڑھا۔ یہ لالو تھا۔ اس کی آنکھیں سُرخ ہو رہی تھیں۔ اور منہ سے شراب کی بدبو آ رہی تھی۔ ایک ہی لمحہ میں میں نے اُس کی نیت بھانپ لی۔ وہ وار کرنا ہی چاہتا تھا کہ پاس پڑی ہوئی لاٹھی اُٹھا کر میں نے اُس کے سر پر دے ماری۔ کمرے کا فرش خون آلود ہو گیا۔ لالو تڑپ کر ٹھنڈا ہو گیا۔

اُس کے ساتھ اور بدمعاش بھی مکان کے نیچے کھڑے تھے۔ یکایک خون خون کا شور بپا ہوا۔ چاقو مہندر بھیّا کا تھا اور اُس کا نام بھی کھدا ہوا تھا۔ نہ جانے بدمعاش لالو کے قبضہ میں وہ چاقو کیسے آیا۔ بہت سے لوگ جمع ہو چکے تھے۔ بھاگنے کی کوشش کرنا فضول تھا اور مہندر کے لئے باعثِ نقصان۔ کچھ ہی لمحوں کے بعد ایک دفعہ پھر آہنی زنجیریں میری طرف بڑھیں اور مجھے ایک تنگ و تاریک چاردیواری میں بند کر دیا گیا۔

چاقو مہندر کا تھا۔ لالو کے ساتھی موقعہ کے چشم دید گواہ تھے۔ اور میرے پاس اُنہیں جھٹلانے کے لئے اپنی صفائی میں کوئی ٹھوس بیان نہ تھا۔ لالو کا زخم مہلک قرار دیا گیا۔ اور بدبختی کی تاریکیاں ایک دفعہ پھر میری زندگی پر چھاگئیں۔ مہندر بھائی کی مہربانی سے عمر بھر میں چند دن خوشی کے دیکھنے نصیب ہوئے تھے۔ قدرت کو وہ بھی پسند نہ آئے۔ اس سزا کا حکم سنتے ہی میرا سر چکرا گیا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ اور کچھ دیر کے لئے میرے حواس باختہ ہو گئے۔ ڈیڑھ سال کا طویل عرصہ مجھے پہاڑ کی مانند نظر آ رہا تھا۔

جب تک قید کی کوٹھڑیوں میں مجھے پہنچا نہ دیا گیا۔ ایسا معلوم دے رہا تھا کہ زبردستی مجھے دوزخ میں دھکیلا جا رہا ہے۔

قید خانے کی چار دیواری میں داخل ہوتے ہی میں نے اُس دن سے چھ ماہ پہلے کا ماحول پایا اور کافی حد تک میرا اضطراب رفع ہو گیا۔ اب پھر وہی روکھے دن تھے اور پھیکی راتیں۔ سوائے صبر کے میرے پاس اور کیا چارہ تھا۔

لطیف سرگرمیاں

ایک عرصہ کے بعد جب میں نے پھر آزادی کی فضا میں قدم رکھا تو جنگ عظیم کی سُرخ آندھیاں دنیا میں چل رہی تھیں۔ تقدیر کی دو زبردست ٹھوکریں کھانے کے بعد میں نے سپاہیانہ زندگی میں قدم رکھنا ہی مناسب سمجھا۔ چنانچہ میں نے بھی اپنی خدمات شاہی افواج کے پیش کر دیں ——

میرا دل دکھیا ہو چکا تھا۔ ایک نہایت محدود سی بستی میں مقید رہ کر بہت سی تکلیفیں برداشت کرنے کے بعد مجھے نئے نئے مقامات۔ کہیں ریل کے سفر۔ کہیں موٹر اور کہیں جہاز کے سفر کا اتفاق ہوا۔ کہیں میدانوں میں چاند اور سورج کی وسعتوں سے لطف اندوز ہوا۔ کہیں لہلہاتے ہوئے میلوں تک پھیلے ہوئے سبزہ زاروں نے آنکھوں کو ٹھنڈک بخشی۔ کسی جگہ صحرا کی تپتی ہوئی ریت نے ہمارا استقبال کیا۔ کہیں گھاٹیوں کے نشیب و فراز سے واسطہ پڑا —— اور کہیں ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کی لہروں نے ہمیں اپنے سینے پر جگہ دی۔ اور اسی طرح دنیا کی وسعتوں کے دلکش نظاروں سے لطف اندوز ہوتا ہوا میں فرانس کے محاذ پر پہنچا۔ تو

کتابِ زندگی کے گزشتہ رنجیدہ ابواب کی دُھندلی تصویر بھی میرے ذہن میں باقی نہ رہی تھی۔ اور گذری ہوئی تمام کلفتیں قطعاً محو ہو چکی تھیں۔

میں نے وہاں اپنے آپ کو ایک نئی دنیا میں پایا۔ آج میں یاد کرتا ہوں تو مجھے ایسے خیال آتا ہے کہ اس وقت میں نے ایک نیا جنم لیا تھا۔ نئی زندگی۔ نیا عزم۔ نئے ارادے۔ نیا استقلال اور تازہ ہمّت نے میرے جسم میں ایک نئی روح پھونک دی تھی۔ افسرانِ اعلےٰ میرے کام سے خوش ہو کر مجھے ترقی دیتے رہے حتّیٰ کہ میں جمعدار ہو گیا۔ میں بڑھتا ہی گیا اور دیگر افواج کے قدم بہ قدم دشمنوں کا صفایا کرتا گیا۔ میں نے وہاں اپنی بہادری کے ایسے ایسے جوہر دکھائے کہ دیکھنے والے دنگ رہ گئے۔

جرمن سیلاب فرانس میں اُمنڈتا ہی چلا آ رہا تھا اور ہندوستانی سپاہی اپنی روایتی شان کے مطابق اُسے روک رہے تھے۔ ایک انگریز کمانڈر کی معیت میں ہندوستانی سپاہیوں کا ایک چھوٹا سا دستہ ایک ایسے مقام پر بھیجا گیا جہاں کچھ جرمنوں نے اودھم مچا رکھا تھا۔ لیکن وہاں پہنچتے ہی جرمنوں نے انہیں چاروں طرف سے گھیرے میں لے کر قیدی بنا لیا۔ یہ خبر پاتے ہی ہمارے دستے کو تیّار کیا گیا۔ ہم آندھی اور طوفان کی طرح گرجتے برستے ہوئے وہاں جا پہنچے اور

اس طور پر کھلبلی مچائی کہ جرمن فوجوں کو وہاں سے بھاگتے ہی بنی۔ اس چھوٹی سی فتح کا سہرا میرے ہی سر رہا۔ چاروں طرف سے آفرین کی آوازیں آئیں اور تمغوں اور نشانوں سے میرے سینے کو لیس دیا گیا؞

میں ان خطروں سے لبریز زندگی میں راحت پاتا تھا۔ اور اپنی جان جوکھوں میں ڈالتے ہوئے ایک خاص لطف محسوس کرتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ تمام عمر انہی لطیف سرگرمیوں میں گذر جائے مگر نہ جانتا تھا کہ قدرت کے نیرنگی پسند دل کو یہ بھی نہ بھائے گا۔ جوں جوں صلح اور امن کے جھنڈے بلند ہوتے گئے محاذ خالی ہونے لگے اور چھاؤنیاں سونی نظر آنے لگیں۔ حتیٰ کہ ہمیں بھی ہندوستان واپس بھیج دیا گیا۔ اور بعد میں خدمات سے سبکدوش کر دیا گیا؞

چار سال کے بعد میں اپنے آبائی شہر پہنچا۔ سرکار نے میری ہمدردانہ خدمات کے صلہ میں گرانقدر انعامات عطا کئے تھے اور اُس کی خبر اس چھوٹے سے شہر میں آناً فاناً پھیل گئی تھی۔ چنانچہ جب میں سٹیشن پہنچا تو بہت سے احباب میرے استقبال کو موجود تھے؞

خود فراموشی

ان احباب میں میرے بچپن کے بہت سے وہ ساتھی موجود تھے جن کے ہمراہ میں نے اوائل عمر کی منزلیں طے کی تھیں اور جو اتفاقات کی بنا پر شاہراہ زندگی پر مجھ سے بہت پیچھے رہ گئے تھے۔ مجھے ہاروں سے لاد دیا گیا۔ بچھڑے ساتھی بھینچ بھینچ کر گلے ملے۔ خوب آؤ بھگت کی گئی۔ اور میدان جنگ کی تھکاوٹ دور کرنے کے لئے رقص و سرود کی محفلیں گرم ہوئیں ؞

کچھ دن بعد آہستہ آہستہ وہ خواہشات ظاہر ہونے لگیں جو کچھ عرصہ کے لئے میدانِ کارزار کے بادلوں کے درمیان گم ہوگئی تھیں۔ ـــــ میٹھے سرود اور گھنگھروؤں کی جھنکار کے درمیان میرے جذبات خفتہ بیدار ہونے لگے۔ اب دن پہلے کے سے نہ تھے۔ میں اپنے تمام ساتھیوں کا خرچ خود برداشت کرسکتا تھا ؞

اِن دوستوں کی محفل میں میں نے رنگ و بُو کی حسین دنیا میں اپنے آپ کو کھو کر راحت اور تسکین حاصل کرنے کی کوشش کی۔ کہ ایک دن کسی کے مرمریں نازک ہاتھ نقرئی جھنکار کی لے پر چھلکتا ہوا جام لئے میری طرف بڑھے۔ تو گرفتار دل ذرا چونکا۔ سر ہلنے نہ

پا یا تھا کہ کسی کی التجا آمیز نرگسی آنکھوں نے جرأت دلائی اور دوسرے لمحے وہ جام میرے لبوں کے ساتھ تھا۔ اُس کے بعد میں سرور کی کیفیتوں میں غرق ہوتا چلا گیا۔ مجھے یہ یاد نہ رہا کہ قارون کے خزانے بھی ان رنگین محفلوں کے لئے ناکافی ہوتے ہیں ۔

میں سمجھتا تھا کہ اب تمام عمر یونہی مدہوشی میں گذر جائے گی۔ میں نے کبھی یہ سوچنے کی کوشش ہی نہ کی کہ جب یہ محدود سی دولت ختم ہو جائے گی تو روٹی کے خشک ٹکڑے بھی میسّر نہ ہوں گے ۔ اور دوستوں کی وفاداریاں اور ساتھیوں کی ہمدردیاں بھی ساتھ ہی ختم ہو جائیں گی ۔ میں دوستوں کی بھری محفل ۔ رقص و سرود ۔ جام و طعام ۔ شراب و شباب کو دیکھتا اور اُس سے محظوظ ہوتا لیکن میں نے کبھی یہ سمجھنے کی کوشش نہ کی کہ یہ کیوں ہے ؟ سمجھتا تھا کہ یہ سب میرے لئے ہیں اور اب ہمیشہ رہیں گے ۔ بلکہ مستقبل کے خیالی خطرات سینے سے قطعاً مٹ چکے تھے ۔ میں نے کبھی آنے والے زمانے کی طرف نگاہ نہ دوڑائی اور نہ کبھی یہ سوچا کہ کب تک یہ محفلیں برقرار رہیں گی ۔

خاتمۂ عشرت

وقت آنکھیں بند کئے ہوئے خاموشی سے گذر گیا۔ ایک ہی بہار نے یہ رنگینیاں دیکھیں اور پھر خزاں کے آثار نمودار ہونے شروع ہوئے۔ پونجی کے خاتمہ کے ساتھ ساتھ ہوا بدلنی گئی۔ رونق مدھم ہوتی گئی۔ دوست ایک ایک کر کے رخصت ہونے لگے۔ محفلیں سرد ہونے لگیں اور آہستہ آہستہ سنسان ہوگئیں۔ میری آنکھوں سے خود فراموشی کے پردے ہٹنے لگے اور مجھے احساس ہونے لگا کہ کیا سے کیا ہو رہا ہے۔ مستقبل قریب کی ڈراؤنی اور بھیانک شکل بار بار میرے سامنے آنے لگتی +

ابھی بالکل یکہ وتنہا نہ ہؤا تھا۔ تین ساتھی ابھی تک حق غمگساری ادا کر رہے تھے۔ اور اس بُرے وقت میں بھی اُن کا ساتھ میری ڈھارس بندھا رہا تھا۔ تاہم میں ایک ایسی کسک محسوس کر رہا تھا جو جو ایک دلکش خواب سے اچانک بیدار ہونے کے بعد پیدا ہوتی ہے جب کہ وہ خواب ادھورا رہ گیا ہو۔ جام وسبو کی حلاوت کے فراق میں لب ترسنے لگے۔ مگر ایک دن میں نے خود کو تکمیل خواہش کے بالکل ناقابل پایا۔ اک خیال خام سا دل میں اُٹھتا تھا کہ کاش وہ دن پھر آسکیں مگر یہ

ناممکن تھا۔

آخر میرے ساتھیوں نے تجویز پیش کی کہ سوائے اس ترکیب کے اور کوئی چارہ نہیں کہ کسی کی تجوری اڑائی جائے۔ میں ڈرتا تھا۔ مجھے سامنے نظر آرہی تھیں آہنی سلاخیں اور سنگین دیواریں۔ اتنا کچھ ہو جانے کے بعد آج پھر اُس چار دیواری کے خیال سے میں کانپ اُٹھتا تھا۔

ساتھیوں نے ہمت بندھائی اور کہا تم صرف باہر کھڑے رہنا ہم خود سب کچھ کریں گے ——— چنانچہ ایک اندھیری شب نے ہم چاروں کو سیٹھ کے محل کی دیواروں کے سایہ میں پایا۔ پہلے سے تیاری کی ہوئی سازش پر عمل کیا گیا۔ ان تینوں نے اندر جاکر اپنا کام شروع کر دیا۔ دو ساتھیوں نے کچھ زیورات وغیرہ باہر میرے پاس رکھے اور میں نگرانی پر کھڑا رہا۔ اتنے میں محل کے اندر سے ایک غُلغُلہ اُٹھا۔ میں نے چیخوں کا شور سُنا اور پھر بھاگتے ہوئے قدم دیکھے۔ اتنے میں ٹارچ کی تند روشنی میری آنکھوں کو چندھیانے لگی۔ اور دوسرے ہی لمحہ میں مضبوط گرفت میں تھا۔ لاکھ حیلے بہانے کئے۔ باتیں بنائیں پر کسی نے کان نہ دھرا۔ ساتھیوں میں سے بھی کوئی میری نظر نہ پڑا۔ اور پھر وہی ہوا جس کا مجھے خدشہ تھا۔

اب کے ایک طویل عرصہ اسی آب و ہوا میں سب مجھے بسر کرنا پڑا۔

پانچ سال پہلے اور اُس دن کے درمیان کا زمانہ دُھندلے نقوش کی صورت میں میری آنکھوں کے سامنے پھرنے لگا۔ اسی طرح جیسے کسی نے جھنجوڑ کر خواب شیریں سے جگا کر پہلی دنیا میں ہی پہنچا دیا ہو اور پھر کہر اور دھندلے بادلوں کے درمیان مدّھم سی تصویریں نظر آ رہی ہوں؟

آخری ٹھوکریں

ایّام بدبختی نے جسم میں محنت و مشقّت کی عادت ڈال رکھی تھی۔ تقریباً تین سال کے بعد یہ ارادہ لے کر میں نے سنگین چار دیواری کو خیرباد کہا کہ اب مزدوری کر کے امن سے خاموش زندگی گذار دونگا مگر باہر آ کر میں نے جو حالات پائے وہ میری اُمیدوں کے برعکس تھے۔ بیکاری اور بے روزگاری زوروں پر تھی۔ غرباء فاقے کر رہے تھے۔ لوگ سارا سارا دن مزدوری کی تلاش میں سرگرداں پھرتے اور سرمایہ داروں کی ٹھوکریں کھاتے لیکن مزدوری نہ ملتی۔ اور ملتی تو اتنی کم اُجرت پر کہ ایک وقت بھی پیٹ بھر کھانے کو نہ ملتا۔ سٹیشن کے باہر میں آنے جانے والے مسافروں کے پیچھے مزدوری حاصل کرنے کے لئے بھاگ بھاگ کر تھک گیا۔ شرم سے کسی کے سامنے دستِ سوال بھی دراز نہ کر سکتا تھا۔

دو دن کے مسلسل فاقوں سے ہمت نے جواب دے دیا اور میں اپنی آئندہ زندگی کے متعلق سوچنے کے لئے دوسروں سے الگ ایک دیوار کے سایہ تلے بیٹھ گیا۔ اتنے میں دو مضبوط ہاتھوں نے مجھے اُٹھایا اور کچھ دیر بعد میں اُسی سنگین چار دیواری میں تھا۔ مجھے بتایا گیا کہ میرے حالات کو مُشتبہ پاتے ہوئے انسدادی طور پر مجھے گرفت میں لیا گیا۔ اب کی دفعہ مجھے محسوس ہوا کہ بیرونی فضا کی نسبت یہ ماحول میرے لئے کم تکلیف دہ تھا۔ وہاں مزدوری کے لئے دوسروں کے پیچھے مارے مارے نہیں پھرنا پڑتا تھا اور نہ دو دو دن کے فاقے آتے تھے۔ ایک سال پورے اطمینان سے ختم ہو گیا۔ تقدیر کی پے در پے ٹھوکریں کھانے کے بعد مایوسیوں نے مجھے یقین دلا دیا تھا کہ اب میری دنیا یہی ہے مگر مجھے پھر دوسری فضا میں قدم رکھنا پڑا۔

میں سیدھا شہر میں پہنچا۔ ایک جگہ مداری کا تماشا ہو رہا تھا۔ میرا بچپن کا ساتھی کِشنا ہجوم کے اندر گھُسنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ باہر نکلا اور بازار کی طرف چل دیا۔ میں اُس کے پیچھے پیچھے جا رہا تھا وہ ایک اور ہجوم میں گھُس گیا اور تھوڑی دیر کے بعد وہ پھر وہاں سے نکل آیا اور اچانک اُس نے مجھے دیکھ لیا اور خوب تپاک سے ملا۔ وہ مجھے ایک آراستہ و پیراستہ خوشنما مکان

ہیں لے آیا اور کہا کہ یہ اُس کا مکان ہے۔ اس کی حالت پہلے سے بہت زیادہ بدل چکی تھی۔ اب وہ ایک خوش پوش جوان تھا۔ اور اُس کے بشرے سے آسودگی ٹپکتی تھی۔ اُس نے مجھے سب کچھ بتایا کہ ماں کے مرنے کے بعد کس طرح تنگدستی نے اُسے فاقوں پر مجبور کیا اور پھر ایک بدمعاش کی مہربانی کی بدولت کس طرح اُس نے یہ سب دولت حاصل کی ——— ایک سہل اور آسان طریقہ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس صورت میں جب کہ نہایت ہوشیاری سے سرانجام دیا جائے۔ اس نے کہا کہ مجھے ملنے سے دس منٹ کے عرصہ میں اُس نے اٹھارہ روپے حاصل کر لئے۔ اب میں خوب سمجھ گیا کہ وہ بار بار ہجوم میں کیوں گھُستا تھا۔

اُس نے مجھے بھی یہ طریقہ سکھا دیا اور پھر ہم دونوں اکٹھے باہر جانے لگے اور بھولے بھالے پردیسیوں کی جیبیں خالی کرنے لگے۔ کشنا کی مہربانی سے ایک عرصہ تک میں اسی شغل کے ذریعہ نہایت آسانی سے گذر اوقات کرتا رہا لیکن ایک دن قانون کی آہنی زنجیریں ہماری طرف بڑھیں اور ہم دونوں تنگ و تاریک کوٹھریوں میں تھے۔

کشنا کے لئے بھی یہ پہلی بار نہ تھی کہ وہ گھبرا جاتا اور مجھے تو اتنے نشیب و فراز طے کر لینے کے بعد گوشۂ زنداں یا باہر کی فضا میں کوئی

امتیاز نہ رہا تھا۔ بلکہ میں قید کی زندگی سے مانوس ہوتا چلا گیا ٭

ایک عرصہ کے بعد جب مجھے جیل سے نکالا گیا تو میں کچھ اُداس اُداس سا رہنے لگا۔ میں متواتر چھوٹی چھوٹی وارداتیں کرتا رہا اور اپنے دائمی مسکن میں واپس آتا جاتا رہا۔ آج میں نے چودھویں دفعہ اس چار دیواری میں قدم رکھا ہے لیکن مجھے اس کا کوئی افسوس نہیں۔ میں خوش ہوں۔۔۔۔ بہت خوش —— تم سے بہت زیادہ خوش ہوں ٭

بے خوف قیدی بہت کچھ کہہ چکا تھا۔ اُس کے چہرے پر خوفناک تبسّم کھیل رہا تھا۔ قیدی نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور سوچنے لگا کہ اپنی زندگی کی تباہی میں وہ کس حد تک ذمہ دار ہے ٭

روشنی

صبح کی روشنی نمودار ہو چکی تھی۔ اختر نے کھڑکی سے سر باہر نکالا ــــــ سامنے سبزہ کے لہلہاتے ہوئے کھیت تھے اور اُس سے پرے درختوں کے جھنڈ....... ہوا لطیف تھی اور تار کے کھمبوں پر بیٹھے ہوئے کچھ پرند چہچہا رہے تھے.......

اختر نے اوپر نگاہ اُٹھائی۔ سورج کی کچھ کرنیں نمودار ہو چکی تھیں لیکن ہلکے ہلکے سفید بادلوں نے اُنہیں اپنے نیچے چھپا لیا تھا۔ ....دُھندلے بادل روشنی کو چھپائے ہوئے ہیں۔ لیکن روشنی آہستہ آہستہ اُنہیں ہٹا دے گی۔ اور کائنات کی تمام وُسعتیں جگمگا اٹھیں گی۔ یہ سوچتے ہوئے اختر پھر مُنہ موڑ کر بیٹھ گیا۔

ــــــ اُف !...... اب اُسے محسوس ہوا کہ گاڑی کی ہوا کتنی کثیف تھی ــــــ ڈبہ مسافروں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا

گاڑی اپنی پوری رفتار کے ساتھ چلی جا رہی تھی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ انجن کا دھواں ہوا کے ساتھ ڈبّے کے اندر آ رہا تھا ۔

اختر نے پھر کھڑکی سے مُنہ باہر نکالا ۔ کنکر کا ایک ریزہ اُڑ کر اُس کی آنکھ میں لگا ۔ اُس نے آنکھ ملتے ہوئے مُنہ اندر کو موڑا ۔ تو اُس کے چہرے کے عین مقابل دو چمکتے ہوئے بُوٹ لٹک رہے تھے ۔ بوٹوں کے اوپر سفید سلک کی پتلون تھی ۔ اختر نے سر اُٹھا کر دیکھا ۔۔۔۔۔۔ ایک شریف جنٹلمین مُنہ میں سگار رکھے انگریزی لباس میں ملبوس اوپر کی نشست پر بیٹھا تھا ــــــــ پھر اُس نے دائیں طرف دیکھا ۔۔۔۔۔۔ ایک مارواڑی سیٹھ گلے میں سونے کا کنٹھا پہنے ، ہاتھ میں سفری حُقّہ لئے شوق فرما رہے تھے ۔ ساتھ ہی ایک پنڈت جی ہاتھ میں مالا لئے آنکھیں نیم وا کئے آہستہ آہستہ ہونٹ ہلا رہے تھے ۔ سامنے پرانی وضع کی ایک عورت اپنے ننھے بچّے کو چھاتی سے لگائے بیٹھی تھی ۔ اختر دیکھتا رہا ۔ ہوا کثیف ہو رہی تھی ۔۔۔۔۔۔ اُس نے پھر اپنا سر کھڑکی سے باہر نکالا ۔ یہ روشنی اپنی مسافت کو کتنی تیز رفتاری سے طے کر رہی ہے ۔۔۔۔۔۔ قدرت کے اصلی عجائبات کو موڑ توڑ کر مصنوعی رنگ میں پیش کیا جا رہا ہے ۔۔۔۔۔۔۔ اصلیت چھُپ رہی ہے اور

صنعت نئے نئے بہروپ بدل کر جلوہ گر ہو رہی ہے ------

لیکن جوں جوں یہ روشنی بڑھتی جا رہی ہے۔ ابن آدم کے سینوں میں تاریکی پھیلتی جا رہی ہے ..... سادگی مٹتی جا رہی ہے اور دنیا اپنی ضروریات کو روز بروز بڑھائے جا رہی ہے۔ خود غرضیاں اور حرص و ہوس دلوں پر سکّہ جما رہی ہیں۔ مہر و وفا کے نشانات مٹتے جا رہے ہیں .... دلوں میں تاریکی بڑھتی جا رہی ہے ---

---- لیکن سورج کی کرنیں پھیل رہی ہیں۔ دن ہو گیا ہے -----

اور پھر وہ کسی اور سوچ میں غرق ہو گیا ———

اختر کی اپنی زندگی بھی مسلسل حوادث میں گذری تھی۔ درد کی لذتوں سے وہ آشنا تھا۔ کسی بیکس کی آنکھ میں آنسو دیکھ کر وہ تڑپ اُٹھتا اور ان آنسوؤں کو مسکراہٹ میں تبدیل کرنا ہی وہ باعثِ تسکین جانتا تھا۔ یہ ایک فطری خوبی تھی جو قدرت نے اُسے عطا کی تھی۔ وہ کانپور کے ایک شریف گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ اُس کا بچپن ناز و نعمت کی فراوانیوں میں بسر ہوا تھا۔ کسی زمانے میں اُس کا باپ کئی کاروباری اداروں کا مالک تھا۔ دولت بافراط تھی۔

نیکدلی اور خلوص میں مشہور تھا لیکن دولت جہاں انسان کے لئے عزت اور جاہ و جلال پیدا کرتی ہے وہاں بعض اوقات اُسے موت کے مُنہ میں دھکیلنے کا باعث بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ جب انسان کے پاس دولت ہوتی ہے تو اُسے چاہنے والے بھی بہت پیدا ہو جاتے ہیں۔ ایک بازاری حسینہ نے مکر کا جال پھیلا کر اُسے اپنے دام محبّت میں پھنسا لیا اور اختر کا باپ عیش و نشاط کی چکا چوندھ میں عقل کی آنکھوں کو کھو بیٹھا۔ اختر کی والدہ شریف ہندوستانی عورتوں کی طرح ایک وفاشعار بیوی تھی۔ اُس نے اپنے خاوند کو تباہی کے غار میں گرنے سے بچانے کے لئے کئی جتن کئے لیکن میاں کی محبّت کی پینگیں اپنی محبوبہ سے دن بدن بڑھتی ہی گئیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اختر کی والدہ اندر ہی اندر گھُلنے لگی اور کچھ عرصہ بعد اِسی غم میں راہیِ مُلکِ عدم ہوئی۔

بیوی کی وفات کے بعد میاں کو ہوش آئی۔ وہ پچھتائے لیکن وقت ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ اس اثنا میں بیشتر پونجی برباد ہو چکی تھی اور کاروبار بہت حد تک بند ہو چکے تھے۔ جب وہ بیسوا میاں کی پونجی لوٹ چکی تو کسی نئے شکار کی متلاشی ہوئی۔ اُس کی نظرِ انتخاب میاں کے ایک دوست ہی پر پڑی۔ جو کہ کافی مالدار سیٹھ تھا۔ میاں

کی دوستی سیٹھ سے بچپن سے ہی چلی آتی تھی اور کسی زمانے میں ان دونوں کی آپس میں بہت زیادہ محبّت تھی۔ اُنہوں نے اکٹھے ہی کاروبار شروع کیا تھا۔ لیکن بعد میں وہ ایک دوسرے سے علیحدہ ہو گئے تھے۔ اُس بازاری عورت نے سیٹھ کو کسی دعوت میں بُلوا کر اُسے اپنی محبّت میں گرفتار کر لیا۔ اور دن بدن اُس سے تعلقات بڑھانے لگی ؎

میاں کی آنکھوں سے غفلت کی پٹّی اُتری۔ اُس بیسوا کے ہاتھوں وہ خود برباد ہو چکے تھے۔ لیکن یہ نہیں چاہتے تھے کہ وہ ناگن کسی اور کو بھی ڈسے۔ اُنہوں نے ہر چند سیٹھ کو سمجھانے کی کوشش کی اپنی زندگی اور بے سروسامانی کی مثالیں دیں ماضی اور حال کے قصّے بیان کئے لیکن سیٹھ اُس کی محبّت میں اِس طرح اسیر ہو چکا تھا کہ سمجھانے پر اُلٹا برافروختہ ہوتا۔ مگر میاں برابر اُسے اُس بازاری عورت سے محبّت کرنے سے باز رکھتا اور سیٹھ کے دل میں اُس عورت کے متعلق نفرت پیدا کرنے کی کوشش کرتا۔ حتّٰی کہ اُس عورت کے لواحقین نے جب یہ دیکھا کہ یہ شخص ہماری دال نہیں گلنے دے گا تو اُنہوں نے اپنے راستے سے کانٹا ہٹانے کے لئے اُسے ہلاک کروا دیا اور اس کے

بعد ۔۔۔۔ اختر اتنی بڑی دنیا میں اکیلا رہ گیا۔ یہ تھا وہ افسانہ جس سے اُس کا زمانۂ ماضی وابستہ تھا ؞

اس وقت وہ ملازمت کی اُمید میں آگرہ جا رہا تھا۔ گاڑی ایک چھوٹے سے سٹیشن پر کھڑی تھی کہ ایک خوبرو اور خوش پوش نوجوان قدرے بدحواسی کے عالم میں اختر کے سامنے کی نشست پر آبیٹھا۔ اُس کے چہرے پر حسرت و یاس اور گھبراہٹ کے ملے جُلے آثار نمایاں تھے۔ اختر خاموش تھا اور اُس کی طرف بغور دیکھ کر کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کہ اُس نوجوان پر تقریباً بیہوشی کی حالت طاری ہوگئی۔ اُس کا سر سیٹ کے پہلو پر جُھک گیا تھا۔ اختر نے اس کے جسم کو چھوا تو وہ آگ کی طرح تپ رہا تھا۔ یہ حالت دیکھ کر اختر نے دو ایک مسافروں سے التجا کر کے ایک نشست خالی کرا کر آہستہ سے اُسے لٹا دیا۔ اگلے سٹیشن گاڑی تھوڑی دیر کے لئے رُکی اور جہاں تک ممکن تھا اختر نے اُسے کچھ طبّی امداد بہم پہنچائی ؞

نوجوان نے آنکھیں کھولیں لیکن بخار کی شدّت نے اُس کی زبان پر مہر لگا دی تھی ؞

"آپ کہاں جائیں گے ؟" اختر نے دھیمی آواز سے پوچھا۔

لیکن نوجوان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ نہ جانے وہ شدّت بخار کی وجہ سے تھے یا اور کسی دلی یا دماغی صدمہ کی وجہ سے۔ نوجوان نے اپنے کوٹ کی بیرونی جیب کی طرف اشارہ کیا۔ اختر نے اُس میں سے ایک تعارفی کارڈ نکالا۔ اُس پر لکھا تھا۔

"ایم۔ سعید سیٹھ۔ ۱۹ برفی روڈ الہ آباد۔"

گاڑی اپنی پوری رفتار پر جا رہی تھی اور الہ آباد کا نام پڑھ کر اختر عجیب کشمکش و پیچ میں تھا۔ ایک طرف اُس کی فطرت یہ ہرگز گوارا نہ کرتی تھی کہ وہ ایسی بیکسی کی حالت میں ایک انسان کو تنہا چھوڑ کر چل دے۔ دوسری طرف اُس کے سامنے اس کی اپنی زندگی کا سوال تھا۔ ابھی ابھی وہ دہلی سے ناکامی کا مُنہ دیکھ کر آ رہا تھا۔ دہلی میں وہ کسی دفتر میں ملازمت کے لئے گیا تھا۔ صرف ایک ملازم درکار تھا۔ وہ دفتر کے دروازے پر پہنچا ہی تھا کہ اُسے ایک اور امیدوار نظر پڑا۔

"کیا آپ بھی ملازمت کے لئے آئے ہیں؟"

اُس امیدوار نے رحم طلب نگاہوں سے اختر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور اختر نے دیکھا کہ جب اُس نے اُس کی

بات کا جواب اثبات میں دیا تو اُس کے چہرے کی رنگت زرد ہونے لگی۔ اور اُس کی آنکھیں حسرت زدہ انسان کی مانند کھُلی کی کھُلی رہ گئیں۔

"کیوں کیا بات ہے؟"

اختر کے حساس دل نے اُس غریب کے حالات کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا اور امیدوار کی آنکھوں پر شبنم کے دو قطرے مُسکرانے لگے۔

"میری بیوہ ماں نے بہت مشکلوں سے مجھے تعلیم دلوائی تھی اور آج اُسے دوسرا فاقہ ہے۔"

اختر کے دل کو ایک ٹھیس سی لگی۔ وہ تڑپ اُٹھا اُف! ہمارے ملک میں ایسے انسان بھی بستے ہیں جو رات کو بھوکے سوتے ہیں۔ غریب اپنی پونجی کو اولاد کی تعلیم پر خرچ کر دیتے ہیں۔ اُن کی آنکھیں اُن کے سنہرے مستقبل کی طرف امیدیں باندھ کر دیکھتی ہیں مگر اُن نوجوانوں کو جب مکتب سے نکل کر دنیا کے میدان میں آنا پڑتا ہے تو ہر طرف سے ناکامی کا مُنہ دکھائی دیتا ہے۔ بیچارے تلاش روزگار میں در بدر ٹھوکریں کھاتے ہیں لیکن اُن کی قابلیت سوائے اس کے اور کچھ بھی نہیں

ہوتی کہ وہ کسی دفتر میں کلرک کا کام دے سکیں۔ آج ہماری تعلیم کا مقصد محض کلرکی اتک محدود ہے۔ اور پھر بھی جدھر جاؤ "نو ویکنسی" جواب ملتا ہے۔

اختر کا دل اس نوجوان کے لئے رحم کے جذبات سے معمور ہو رہا تھا۔ تاہم اُس نے اُسے کہا۔

"میرے عزیز دوست۔ ہمّت کرو۔ انسان کی مشکلیں ہمّت سے ہی آسان ہوتی ہیں۔"

یہ سُن کر اُس نوجوان کے چہرے پر دیوانوں کی سی مُسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اُس نے معنی خیز نظروں سے اختر کی طرف دیکھا اور پھر نظریں جُھکا لیں۔ اُس کے لب ہلے۔

"آپ درست کہتے ہیں۔۔۔۔ ہمّت۔۔۔۔۔ لیکن اب تو ہم دونوں ہی اُمیدوار ہیں۔"

اور یہ کہتے کہتے پُر حسرت نگاہوں سے اختر کی طرف دیکھنے لگا۔

غمزدہ امیدوار کے مُنہ سے یہ الفاظ سُن کر اختر کچھ سوچ میں پڑ گیا اور اس کی حمیّت نے گوارا نہ کیا کہ وہ ایک فاقہ زدہ عورت کے منہ میں جاتے ہوئے لقمہ کا سدِّ راہ ہو۔ وہ بولا۔

"دوست ـــــ تم ایک ہی اُمیدوار ہو"

اور یہ کہہ کر وہ وہاں سے چل دیا۔

سٹیشن پر پہنچ کر اُسے پھر تلاشِ معاش کی فکر دامنگیر ہوئی۔ وہ اتنا زیادہ فکرمند نہ ہوتا۔ اگر حمیدہ کے باپ نے اُسے یہ طعنہ نہ دیا ہوتا کہ میں ایک بیکار اور بے فکرے انسان کے ہاتھوں میں اپنی بچّی کی قسمت دے کر اُس کی زندگی تباہ کرنا نہیں چاہتا۔

اختر اور حمیدہ کا بچپن ایک ساتھ گذرا تھا۔ جن دنوں اختر کے والد کا کاروبار خوب چمک رہا تھا۔ حمیدہ کا باپ اس کا محبوب ترین کارندہ تھا۔ اور وہ سب اکٹھے رہتے تھے۔ زمانے نے انقلاب دیکھے لیکن اختر اور حمیدہ کی محبّت بڑھتی ہی گئی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو اپنا جیون ساتھی منتخب کر چکے تھے۔ لیکن ایک مدت کے بعد جب ارمانوں کو پورا کرنے کا وقت آیا تو اختر کی بے سروسامانی شومئ قسمت کا باعث ہوئی اور حمیدہ کے باپ نے اُسے صاف جواب دے دیا۔ دراصل وہ لالچی بوڑھا اُس کی شادی ایک رئیس زادے اسلم سے کرنا چاہتا۔ اسلم اگر صرف رئیس زادہ ہی ہوتا تو اختر میں اتنا مادۂ ایثار موجود تھا کہ وہ حمیدہ کی بہتری کے لئے خود علیحدگی اختیار کر لیتا۔ لیکن وہ دیکھ رہا تھا کہ ایک

اوباش اور بدچلن انسان کی دولت کے لالچ نے اُسے اندھا بنا دیا ہے۔ جس وجہ سے اُس نے ارادہ کیا کہ جس طرح ہو سکے اپنی حالت کو کم از کم ایسا بنا سکے کہ حمیدہ کا باپ اس وجہ سے اُسے حمیدہ سے منسوب کرنے سے انکار نہ کر سکے کہ وہ بیکار اور بے فکرا ہے۔ ملازمت کی تلاش میں وہ دہلی گیا لیکن وہاں سے اُس کی ایثار پسند طبیعت اُسے واپس لے آئی۔

وہ دہلی کے سٹیشن پر کھڑا اپنے مستقبل کو سوچ رہا تھا کہ اخبار میں "ضرورت ہے" کی سرخی اُسے نظر آئی اور وہ اُسی لمحہ آگرہ کے لئے تیّار ہو گیا۔ اُسے یقین تھا کہ آگرہ میں اُسے ضرور معقول ملازمت مل جائے گی۔ کیونکہ اُس میں وہ تمام خوبیاں موجود تھیں جو اشتہار دہندہ کو مطلوب تھیں۔ اُسے اپنی امیدیں پھر پوری ہوتی نظر آرہی تھیں کہ راستے میں یہ واقعہ پیش آگیا۔

ادھر وہ ایک بیمار نوجوان کو کس مپرسی کی حالت میں تنہا دیکھ رہا ہے۔ اگر وہ انسانی فرض کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کے ساتھ الہ آباد تک جائے تو اس اثنا میں آگرہ کی ملازمت سے بھی ہاتھ دھونے کا خطرہ ہے۔ اگرچہ اس لمبے سفر میں گاڑی

سے اس ڈبہ میں اور بھی بہت سے مسافر آئے اور چلے گئے۔ جن میں غالباً وہ بھی ہوں گے جو مسجدوں کے ممبروں پر کھڑے ہو کر نیکی اور ہمدردی کے سبق دیا کرتے ہیں۔ مندروں کی مسندوں پر بیٹھ کر ادنےٰ ترین مخلوق کی سہایتا کی تلقین کیا کرتے ہیں۔ قومی سیٹیج پر کھڑے ہو کر خدمتِ خلق کے دعوے کیا کرتے ہیں۔ مگر ان میں سے کوئی بھی شخص اس مریض کے لئے قطعاً فکرمند نہ ہوا۔ جسے مسافرت میں اکیلا دیکھ کر بیماری نے آدبوچا تھا۔

اختر سوچتا رہا اور سب کچھ سوچ لینے کے بعد وہ اس حد تک مستعد ہو گیا کہ جیسے وہ گھر سے ہی فقط اس بیمار نوجوان کی تیمارداری کے لئے چلا تھا۔ سفر میں ایک مریض کی خدمت کرتے ہوئے اُسے کچھ اس قدر لطف محسوس ہوا کہ وہ اِن لمحوں میں بالکل بھول گیا کہ وہ کس ارادے سے گھر سے چلا تھا۔

سعید کی حالت میں کچھ تسلّی بخش تبدیلی نہیں ہو رہی تھی۔ لمحہ بہ لمحہ اُس کی حالت دگرگوں ہو رہی تھی۔ وہ تقریباً بیہوش تھا۔ کبھی کبھی بے ہوشی کے عالم میں بڑبڑا اُٹھتا تھا۔

"تم نے دغا دیا نعیمہ ——"

اُس کی آنکھوں سے آنسو بہ نکلتے۔ مسلسل بہے جاتے

اور تھمتے ہی نہ تھے۔

اختر اُس سے لاکھ پوچھتا کہ کچھ تو بتاؤ بات کیا ہے مگر وہ اُس کے سوال کا جواب دینے کی قدرت ہی نہ رکھتا تھا۔ اس کا جسم اس وقت حرارت کے انتہائی درجوں میں سے گذر رہا تھا۔ اور اختر اُس کے پاس بیٹھا ایسا محسوس کر رہا تھا جیسے آگ کے پاس بیٹھا ہو۔ تاہم وہ اُس کی تیمارداری برابر کئے جا رہا تھا۔

سعید بالکل خاموش تھا لیکن کبھی کبھی ایسے الفاظ بڑبڑا دیتا۔

"ہائے .... مجھے برباد کر دیا!!"

"تم نے سب کچھ چھڑا دیا نعیمہ .... اب مجھے بھی چھوڑ دیا؟؟" ....

وہ بڑبڑا رہا تھا اور ان الفاظ میں ایک دردناک رقت تھی۔ جب وہ کوئی ایسا فقرہ کہتا تو ارد گرد کے مسافر نہایت غور سے سُنتے اور کسی تہ تک پہنچنے کی کوشش کرتے۔ بعض اُسے اپنا واقعہ سُنانے کے لئے التجا کرتے مگر وہ جواب میں صرف رُو دیتا۔

کون جانتا تھا کہ سعید کے ان آنسوؤں میں کتنے دردناک افسانے مضمر تھے ...... یہ راز تھے جو اُس کے سینے میں ہی رہے ــــــ

کئی مسافر آئے اور اپنی اپنی منزل پر اُتر گئے۔ لیکن اختر اُس کے ساتھ ہی رہا۔ بہت منازل طے کرنے کے بعد گاڑی الہ آباد کے سٹیشن پر پہنچی اور اختر کو کچھ تسکین محسوس ہوئی۔ احتیاط سے سعید کو لے کر سٹیشن سے باہر آیا۔ اور ایک گاڑی کرایہ پر لے کر شوفر کو برفی روڈ نمبر ۱۹ پر چلنے کے لئے کہا۔ گاڑی بنگلہ نمبر ۱۹ کے سامنے جا کر رُکی۔ یہ ایک شاندار کوٹھی تھی۔ جس کی خوبصورت عمارت اور خوشنما باغیچہ اُس کے مکین کی خوشحالی کا پتہ دے رہے تھے۔

اپنے بنگلے کو دیکھ کر سعید کی طبیعت کچھ سنبھلی۔ گھبراہٹ اُس کی کچھ حد تک دور ہوئی۔ اور اُس کی آنکھوں میں کچھ چمک سی پیدا ہوئی۔ وہ اُٹھ کر سیٹ پر بیٹھ گیا۔ تشکر آمیز نگاہوں سے اپنے محسن کی طرف دیکھنے لگا اور نہایت دھیمی آواز میں گاڑی اندر لے چلنے کے لئے کہا۔ جونہی گاڑی بنگلے کے اندر پہنچی۔ رئیسانہ وضع کا ایک ادھیڑ عمر آدمی اُن کی طرف بڑھا۔ اختر نے کھڑکی کھولی تو وہ شخص سعید کو گاڑی میں دیکھ کر بیٹا! بیٹا! کہتا ہوا گاڑی کی طرف لپکا۔ سعید نے بھی اُٹھنے کی ناکام کوشش کی اور ہاتھ پھیلائے۔ معمر شخص نے سعید کو

سہارا دیتے ہوئے کہا۔

"میں جانتا تھا سعید! تمہیں جلد ہی اپنی غلطی کا احساس ہوگا۔۔۔۔۔۔۔ ماں باپ کو چھوڑ کر کوئی انسان سُکھ نہیں پا سکتا۔"

"میں غلطی پر تھا ابّا۔۔۔۔۔۔۔"

اور اِسی قسم کی باتیں دونوں باپ بیٹا کرتے رہے۔ مگر اختر ان باتوں کو سمجھنے سے قاصر تھا۔ وہ آس پاس کے دیگر ماحول سے بے خبر کھڑا اُن کی طرف دیکھ رہا تھا کہ سعید نے نحیف آواز سے باپ کو بتایا کہ "آپ میرے مُحسن ہیں۔"

احسانمندی کی چمکتی ہوئی نگاہوں سے شریف سیٹھ نے اختر کی طرف دیکھا۔ اور ایسی ہی نگاہیں ہوتی ہیں جن کی روشنی کسی انسان کی ایثار پسندیوں کا ماحصل ہوتی ہے۔

سیٹھ کے مُنہ سے اُس وقت اور کچھ لفظ نہ نکل سکا۔ پاس کھڑے ہوئے نوکر کو کہا کہ "ان کو ٹھہراؤ"۔ اور اختر سے مخاطب ہُوا کہ "میں ابھی حاضر ہوا"۔ سعید کو اندر لے گیا۔

ایک گھنٹہ اختر کو تنہا بیٹھنا پڑا۔ چونکہ وہ ایک انسانی فرض سے سبکدوش ہو چکا تھا۔ اُس کے تخیّلات نے نہ جانے کہاں سے کہاں تک کتنے ہی سفر کر ڈالے۔۔۔۔۔۔ اور اُس کے تمام

تخیلات سمٹ سمٹا کر پھر حمیدہ کی طرف جا پہنچے ۔۔۔۔۔ وہ اُس کے لالچی باپ کو کیسے خوش کر سکے ؟ ۔۔۔۔۔۔

اب اس کے دل میں یہی خیال رہ گیا تھا اور وہ سوچ ہی رہا تھا کہ ایک شفقت بھری آواز نے اُسے چونکا دیا۔

"تم نے ہم پر بہت بڑا احسان کیا بیٹا" سیٹھ جی نے پاس کی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کلام کو جاری رکھا۔

"معاف کرنا مجھے ذرا دیر ہوگئی ہے۔ سعید کے لئے ڈاکٹر کو بھی بُلانا تھا اور سلیمہ بیچاری تو اتنی کمزور دل ہے کہ بھائی کو اس حالت میں دیکھ کر ابھی تک اُس کے آنسو نہیں تھمے۔ ۔۔۔۔ سعید نے ہمیں سب کچھ بتایا ہے کہ کس طرح آپ دیکھ بھال کرتے ہوئے اُسے یہاں تک لائے۔ بیٹا اگر تم نہ ہوتے تو ۔۔۔۔۔ خدا جانے سعید کا کیا حال ہوتا۔۔ ۔۔۔۔۔؟"

سیٹھ جی بات کا تسلسل قائم رکھے جا رہے تھے اور اُن کی آنکھیں کچھ ڈبڈبائی سی ہوئی تھیں۔

"ہماری زندگی کا تو سہارا یہی ہے ۔۔۔۔۔ دو مہینے ہوئے چپکے سے گھر سے چلا گیا تھا ـــــ سو جتن کئے چاروں طرف

ڈھنڈوایا مگر کوئی پتہ نہ چلتا تھا ...... روتے روتے ہمارے آنسو بھی خشک ہو گئے تھے ۔ چین و آرام حرام ہو گئے تھے ۔ ۔ ۔ ۔ کھانا پینا تک چھوٹ گیا تھا ——— شکر ہے پروردگار کا کہ اُس نے ہماری دعاؤں میں اثر پیدا کیا اور آپ کو فرشتہ بنا کر اُس کے ساتھ بھیجا ۔ ہم آپ کے جتنے بھی احسانمند ہوں کم ہے ۔"

"میرے احسانمند ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے ۔ قدرت نے اُسے آپ کے پاس پہنچانا تھا پہنچا دیا ۔ میرا تو انسانی فرض تھا جو میں نے ادا کیا ۔" اختر نے جواباً کہا ———

"سچ ہے ۔ قدرت نے ہی ہم پر مہربانی کی ہے ۔ مگر اس نفسا نفسی کے عالم میں اور اس جدید تہذیب کی روشنی کے زمانے میں جب کہ ایک انسان دوسرے بھائی کا خون تک پینے سے دریغ نہیں کرتا ایسے فرشتہ خصلتوں کی بہت کمی ہے ۔ جو خود کو تکلیف دے کر دوسروں کو آرام پہنچانے کی کوشش کریں ۔"

اتنے میں چائے آ گئی ——— سیٹھ جی اور اختر پیتے رہے ۔ اور اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں ۔ یکایک اختر کو کچھ خیال آیا ———

"مگر سعید گیا کہاں تھا ؟" اُس نے پوچھا ۔

"یہ بھی بیٹا ! ایک طویل داستان ہے ۔" سیٹھ جی نے پیالی

میں چائے انڈیلتے ہوئے کہا۔

"پھر بھی کچھ معلوم تو ہو" اختر نے زیادہ دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

"اکثر انسانوں کی زندگی میں ایک ایسی منزل بھی آتی ہے کہ جوانی کے نشہ میں جھوٹی محبت کی روشنی آنکھیں چندھیا دیتی ہے۔ اور انسان اپنا نفع نقصان سوچے بغیر قدم بڑھائے چلا جاتا ہے۔ ایسا ہی واقعہ سعید سے ہوا۔"

سیٹھ جی نے سنجیدگی سے ایک طویل قصّے کو مختصر کرتے ہوئے جواب دیا اور پھر اختر نے اس بارہ میں کچھ زیادہ پوچھنا مناسب نہ سمجھا۔

"اب مجھے واپس جانا ہوگا" اختر نے چائے کی پیالی ختم کرتے ہوئے اجازت طلب نگاہوں سے سیٹھ جی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ایں!! کیا کہا؟------واپس جانا ہوگا؟ اور ابھی؟؟--
--- اتنے لمبے سفر میں رہے ----- ابھی دو چار دن تک تو تکان ہی دور ہوگی" سیٹھ جی نے چونکتے ہوئے کہا۔

"نہیں سیٹھ جی۔ میں ایک خاص مقصد لے کر گھر سے چلا تھا۔

مجھے جلدی آگرہ پہنچنا ہے۔ شاید میری قسمت یاور ہو"۔۔۔۔اختر نے کہا۔

"خیر تو چلے جانا!!! آخر اتنی جلدی بھی کیا ہے۔ ابھی تو اپنے متعلق آپ نے کچھ فرمایا ہی نہیں۔ آپ کہاں سے آرہے تھے؟" سیٹھ جی نے پوچھا۔

"اس وقت تو دہلی سے آرہا تھا۔۔۔۔۔۔ پہلے کانپور سے دہلی گیا تھا۔۔۔۔ دہلی سے آگرہ کا ارادہ کیا تو الہ آباد پہنچ گیا۔"

یہ الفاظ اس بے نیازی سے اختر نے ادا کئے کہ سیٹھ جی کو اُس کی باتوں میں دلچسپی معلوم ہونے لگی۔

"آپ سب کچھ بتلاتے کیوں نہیں؟۔۔۔۔۔ کہاں کے رہنے والے ہیں؟۔۔۔۔۔ کس کے بیٹے ہیں؟ کہاں جارہے تھے؟۔ ۔۔۔۔ کیوں جا۔۔۔۔۔۔۔؟؟

سیٹھ جی نے سوالات کی بوچھاڑ کردی۔

"والد صاحب تو آج چودہ برس ہوئے کسی دشمن کے ہاتھوں اللہ میاں کے گھر پہنچ گئے" اختر نے سب کچھ سُنانے کا ارادہ کرتے ہوئے کہا۔

"وہ کیسے؟" سیٹھ جی نے چونک کر پوچھا۔

"ایک بازاری عورت نے اُنہیں تباہ کرنے کے بعد اُن کے ایک دوست کو جال میں پھانسنا چاہا اور والد صاحب کو اپنے کام میں رُکاوٹ خیال کرتے ہوئے اُن کو کسی سے ہلاک کروا دیا"۔

"یہ کہاں کا واقعہ ہے ؟"

"کانپور کا !"

"کانپور کا ؟......... آج سے چودہ سال پہلے ؟"

"ہاں .... کیوں آپ .... ؟ ؟"

"کچھ نہیں ۔ آپ کہے جائیے"

اور اختر نے اپنی تمام رام کہانی کہہ سُنائی ۔ سیٹھ جی خاموش تھے ۔ اُن کی آنکھیں بند تھیں ۔ مگر آج سے چودہ سال پہلے کے واقعات ایک ایک کرکے اُن کے سامنے سے گذر رہے تھے ۔ جوانی کے اُن پر اندوہ ایام کی یاد اُن کی تمام کیفیات پر حاوی ہو چکی تھی ۔ جب کہ اُن کے ایک دوست نے اُنہیں تباہی کے غار میں گرنے سے بچاتے بچاتے اپنی جان دی تھی ۔ اختر بے خبری میں سب کچھ سُنائے جا رہے تھے اور سیٹھ جی سُنے جا رہے تھے ۔ لیکن جب اختر سب کچھ کہہ چکا تو اُس نے دیکھا کہ سیٹھ جی کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے ۔

"آپ رو رہے ہیں سیٹھ جی ؟"

"کچھ نہیں بیٹا۔ یونہی...... اب تم آرام کرو۔ میری طبیعت کچھ پریشان سی ہو رہی ہے۔ اب کل باتیں کریں گے"۔

یہ کہہ کر سیٹھ جی آنکھوں سے آنسو خشک کرتے ہوئے اندر چلے گئے۔

رات ہو چکی تھی۔ اختر عجیب ذہنی کشمکش میں مبتلا تھا۔ اگرچہ لاکھ خیالات اور سوچ بچار میں گھرا ہؤا تھا۔ مگر آج تین دن سے وہ آنکھ بھی نہ جھپکا سکا تھا۔ بہت تھکا ماندہ تھا۔ بستر پر لیٹتے ہی اُسے نیند آگئی۔

سفر کی تکلیف وہ تھکاوٹ کے بعد گھر کی آسائش پا کر اور معقول طبّی امداد ملنے پر سعید کی حالت لحظہ بہ لحظہ بہتر ہوتی گئی۔ اگلی صبح جب سیٹھ جی اور اختر ناشتے پر بیٹھے تو سعید بھی اُن کے پاس ایک آرام کرسی پر آلیٹا۔

"میں عمر بھر ان کا احسانمند رہوں گا ابّا جی"!

سعید نے اختر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

سیٹھ جی نے معنی خیز نظروں سے اختر کی طرف دیکھا جیسے پھر کچھ یاد آگیا ہو۔ وہ بالکل خاموش رہے.... اتنے خاموش کہ اُن کے جذبات کو اُن کے چہرے سے اختر اور سعید دونوں میں

سے کوئی بھی نہ سمجھ سکا۔ تینوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور چند لمحے خاموش رہنے کے بعد سیٹھ جی اختر کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔

"تم یہیں رہو اور یہی اپنا گھر سمجھو بیٹا"۔

"مجھے خود آپ سے جدا ہونے میں افسوس ہوگا مگر میں اپنی تمام مجبوریاں آپ کے گوش گذار کرچکا ہوں۔ آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ میرا اب زیادہ ٹھہرنا مناسب نہیں"۔ اختر نے جواب دیا۔

"نہیں اختر تم نہیں جاسکو گے ...... تمہیں نہیں جانا چاہیئے۔ سیٹھ جی نے بھرّائی ہوئی آواز میں پورے زور سے اختر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا اور اختر نے دیکھا کہ اُن کی آنکھوں میں پھر آنسو ڈھلک آئے تھے۔ اختر نے زیادہ مجبور کرنا مناسب نہ سمجھا اور خاموش ہورہا۔

دن گذرتے گئے۔

اختر دنیا میں اکیلا تھا۔ نہ ماں کا دستِ شفقت نہ باپ کا سایہ اور نہ بھائی بہنوں کی محبّت۔ لے دے کے اگر اُس نے کسی سے اپنی زندگی کو وابستہ کرلیا تھا تو وہ اُس کی جان سے پیاری

حمیدہ کا خیال تھا جس کی یاد اکثر اُسے بے چین کر دیتی اور وہ کسی تیر کھائے ہوئے زخمی کی طرح دل مسوس کر رہ جاتا۔

تاہم سیٹھ جی اور سعید کی پاکیزہ اور بے لوث محبّت اور دلداریوں نے اختر کی اُداسیوں پر ایک حد تک پردہ ڈال دیا تھا۔

اختر کو کاروبار کی دیکھ بھال میں شامل کر لیا گیا اور سیٹھ جی کی مہربانیاں اُس پر دن بدن بڑھتی ہی گئیں حتّٰی کہ انہوں نے ایک فرم کا کُل کاروبار اُس کے سپرد کر دیا۔ اختر خوب دل لگا کر اور ایمانداری سے محنت کر رہا تھا۔ اگرچہ اُس کی اپنی فطرت بھی مقتضی تھی کہ وہ ایمانداری سے محنت کرے۔ لیکن مستقبل کے شاندار تصوّر کے خیال سے وہ اور بھی زیادہ محنت سے کام کرتا۔ مستقبل میں اُسے سرمایہ داری کا خیال نہ تھا بلکہ وہ دیکھ رہا تھا کہ ایسا کرنے سے وہ خود کو اس قابل بنا سکے گا کہ حمیدہ کے باپ کی خوشنودی حاصل کر کے اُن ارمانوں کو پورا کر سکے گا جو وہ برسوں سے اپنے سینے میں دبائے بیٹھا تھا۔ اور یہی شاندار مستقبل اُس کے پیشِ نظر تھا۔ جس کی روشنی نے اُس کے دل کو منوّر کر کے اُس کے دماغ اور جسم میں معمول سے زیادہ کام کرنے کی صلاحیت پیدا

کردی تھی۔

ایک سہانی شام کو اختر کوٹھی سے ملحقہ باغیچے میں ایک بنچ پر بیٹھا آنے والے زمانے کے میٹھے خواب دیکھ رہا تھا۔ سورج ابھی غروب نہ ہؤا تھا۔ شفق کی ہلکی ہلکی روشنی اختر کے چہرے پڑ رہی تھی۔ اور اُس کے مردانہ حُسن کو اور بھی زیادہ دلکش بنا رہی تھی۔ اُس کے تصوّرات اُسے دور لے گئے تھے .... بہت دور ...... پھولوں کی ایک خوشنما وادی میں۔ جہاں اُس کی محبوبہ غنچوں سے کھیل رہی تھی۔ اور وہ ہمہ تن شوق ہو کر اُسے دیکھ رہا تھا .... وہ بار بار مسکراتی تھی اور پھولوں کی طرف دیکھتی جاتی تھی۔ حتّےٰ کہ اُس نے ایک پھول توڑا۔ ایک نہایت حسین پھول جو اُس سے بھی زیادہ حسین تھا .... اور اُس کی طرف بڑھایا۔ مگر وہ خاموش بیٹھا اُسے دیکھتا رہا حتّےٰ کہ اُس نے وہ پھول اُس کی طرف پھینک دیا ——— دفعتاً پھولوں کا ایک چھوٹا سا گلدستہ اُس پر آگرا اور وہ چونک کر اُچھل پڑا ———

باغیچے کے سامنے کی منزل سے نقرئی قہقہوں کی آوازیں آئیں۔ اُس نے سر اُٹھا کر دیکھا تو حسن و شباب کا ایک مجسمہ ہنستا ہؤا سامنے پایا جو آنکھیں ملتے ہی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اختر

نے جونہی نگاہ نیچے کی۔ سیٹھ جی اُس کے سامنے کھڑے مُسکرا رہے تھے۔

"تسلیمات عرض ہے۔" اختر نے کھسیانے ہوتے ہوئے کہا۔

"خوش رہو بیٹا۔ یہاں اکیلے بیٹھے کیا کر رہے ہو آؤ ذرا گھوم آئیں۔" یہ کہہ کر سیٹھ جی اختر کو ساتھ لے گئے۔

سیٹھ جی کی اولاد میں سے ایک تو سعید تھا اور دوسری سلیمہ۔ سلیمہ نہایت شوخ اور چنچل دوشیزہ تھی۔ پندرہ سولہ کا سن تھا اور بلا کی خوب صورت تھی۔ جس دن سے اختر کی باتیں اُس نے سُنی تھیں دل سے اُس کی گرویدہ ہو چکی تھی۔ جب کبھی موقعہ پاتی پہروں اُسے دیکھا کرتی۔ اُس کی عادت و خصائل اور دلکش جوانی کو دیکھ دیکھ کر اُسے اختر سے محبّت ہوتی گئی ——

اس محبّت کو وہ ہمیشہ خاموشیوں میں چھپاتی رہی۔ حتّٰی کہ اس ٹائم جب اختر کو بہت دیر تک وہ دیکھتی رہی اور وہ بُت کی مانند خاموش اور بے حس و حرکت بیٹھا رہا تو اُسے شرارت سوجھی۔ اور اُس نے پھولوں کا ایک گلدستہ اُس پر پھینک دیا جس سے وہ اُچھل پڑا اور اختر کی اس بوکھلاہٹ پر شوخ طبع سلیمہ کو ہنسی آگئی۔ اتفاق سے سیٹھ جی بھی عین وقت پر باغیچے

میں پہنچے اور یہ تمام منظر دیکھا۔ سیٹھ جی زمانے دیکھ چکے تھے اور خود سب نشیب و فراز طے کر چکے تھے۔

سلیمہ اُن کی بہت لاڈلی بیٹی تھی اور اختر کی خوشنودی وہ فرض سمجھتے تھے۔ ان دونوں کی محبّت میں مزاحم ہونا انہوں نے مناسب نہ سمجھا۔ بلکہ دونوں زندگیوں کو ایک ہی لڑی میں منسلک کرنے کے خیال کو وہ دن بدن تقویت دینے لگے۔ اور اس وجہ سے اختر کی بہبودی کا اور بھی زیادہ خیال رکھنے لگے۔ اب اختر اُن کے گھر کا محبوب ترین فرد بن چکا تھا۔ جس سے وہ سب محبت کرتے تھے اور اُسے اپنا جانتے تھے۔

اب سلیمہ اختر اور سعید اکٹھے سیر کو جاتے۔ خوش گپیاں ہوتیں۔ شائستہ اور مہذّب مذاق ہوتے جس سے سلیمہ اور اختر کی بے تکلّفی دن بدن بڑھنے لگی اور دونوں کے دل ایک ہوتے چلے گئے۔ سلیمہ کی میٹھی میٹھی باتوں اور محبت بھرے لفظوں نے اختر کے جوان دل کو موہ لیا اور حمیدہ کی یاد آہستہ آہستہ اُس کے تصوّر سے محو ہونے لگی۔ پھر بھی جب کبھی اُسے طویل تنہائی میسّر آتی تو آنسو کا ایک آدھ قطرہ ضرور ایّام گذشتہ کی یاد میں اُس کی آنکھوں سے گر جاتا اور حمیدہ کی یاد اُسے بے چین کر دیتی۔

جب اُسے سعید، سیٹھ جی اور سلیمہ کا خیال آتا اور پھر ایک سال پہلے کے زمانے کو یاد کرتا —— چند ہنگامی واقعات اور اس کے بعد محبّت بھرے تعلقات کا پیدا ہونا۔ واقعات اور حالات کی تیز رفتاری اُسے شک میں ڈال دیتی۔ کبھی کبھی وہ پہروں حیرت میں بیٹھا سوچا کرتا کہ ایک بے کس پر اتنی بے پناہ مہربانیاں کس لئے کی جا رہی ہیں —— بعض اوقات اُس کی نظریں کہیں دور پہنچنے کی کوشش کرتیں تو وہ خوف سے تھرّا اُٹھتا اور اُسے ایسا معلوم ہوتا کہ دُھندلکے میں تیز ہوائیں اُسے اوپر اُڑائے لئے جا رہی ہیں۔ نہ جانے کب ہوائیں تھم جائیں اور اُسے کسی چٹان پر نیچے گرا دیں ——

کئی بار اختر نے کانپور جانے کا ارادہ کیا مگر اس کی کاروباری مصروفیتیں اُسے نہ جانے دیتیں اور اگر کبھی ان مصروفیتوں سے چھٹکارا بھی ہوتا تو سلیمہ کا اصرار اور مُلتجیانہ نگاہیں اُسے اپنے ارادے کو کچھ عرصہ اور ملتوی کرنے پر مجبور کر دیتیں اور وہ حمیدہ کے باپ کو صرف ایک خط لکھنے پر اکتفا کرنے پر مجبور ہو جاتا۔ ایک سال اسی طرح گذر گیا ——

ایک دن اختر اپنے دفتر میں بیٹھا تازہ ڈاک کو دیکھ رہا تھا۔

نیلے رنگ کے ایک لفافے کو کھولا اور پڑھا۔

"روح نواز!

سلام آخری لو۔

تم نے دلچسپیوں میں کھو کر اپنی حمیدہ کو بھلا دیا۔ کیا کبھی یہ محسوس کرنے کی کوشش بھی کی کہ کسی کی آنکھیں تمہارے دیدار کے لئے مدّت سے پیاسی ہیں۔ اختر! تم تو کبھی بھی مجھ سے جدا ہونے والے نہ تھے...... تم تو ایک دن بھی مجھے بھولنے والے نہ تھے۔ تمہیں کیا ہو گیا اختر؟ —— شاید تم بھول گئے کہ کسی کے سینے کی دھڑکنیں تمہاری یاد میں ایک ایک پل گن رہی ہیں —— اچھّا تمہیں اپنی نئی رنگینیاں مبارک۔ مجبوریاں مجھے عنقریب کسی دوسرے کے ہاتھ میں سونپ رہی ہیں۔ چند دن بعد سیم و زر کی قربانگاہ پر ایک باپ اپنی بیٹی کو بھینٹ چڑھا دے گا اور کسی کی آرزوئیں ہمیشہ کے لئے مٹ کر رہ جائینگی تم مجھے بھلا دو اختر۔ مگر سماج کی نظروں میں کسی کی ہو جانے کے باوجود بھی میرے تخیّلات تمہارے تصوّر سے آباد رہیں گے۔

تمہاری حمیدہ"

خط پڑھ کر اختر کی آنکھوں سے آنسو ڈھلک پڑے۔ ایّام

گذشتہ کا تصور اُس کے سامنے پھر گیا۔ واقعی میں نئی دلچسپیوں میں بہت کچھ بھول گیا۔ نہ جانے غریب حمیدہ اس وقت کس حال میں ہوگی۔ وہ تڑپ اُٹھا اور اگلے دن سیٹھ جی سے اجازت لے کر کانپور روانہ ہو گیا۔

شام ہو چکی تھی۔ کانپور کے سٹیشن سے اختر پیدل ہی شہر کو چل دیا۔ کانپور کی سر زمین پر پہنچ کر اُس کا دل جذبات کے ہجوم سے دھڑک رہا تھا۔ نہ جانے کن خیالوں میں محو وہ چلتا چلتا قریب کے ایک باغ میں پہنچ گیا۔ اور بجلی کی روشنی کے نیچے سبز گھاس کے اوپر بچھے ہوئے ایک بنچ پر بیٹھ گیا۔

وہ گہری سوچ میں تھا کہ اُسے کچھ قریب سے کسی کے سسکیاں بھرنے کی آواز آئی اور اختر کے دل کو جیسے کسی نے جھنجھوڑ کر جگا دیا ہو۔ کسی مظلوم کی آہ سُن کر وہ بے چین ہو گیا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اُس کے دائیں طرف کچھ دور اندھیرے میں پتھر کی بنچ پر ایک نوجوان لڑکی بیٹھی رو رہی تھی۔

اختر کا دل رحم اور ہمدردی کے جذبات سے معمور ہو گیا اور اُس نے نہایت نرم آواز سے پوچھا۔

"آپ کون ہیں؟"

لیکن سوائے سسکیوں کے اُسے کوئی جواب نہ ملا۔

اختر نے دوبارہ پوچھا "آپ کون ہیں اور اس وقت یہاں

....

"مظلوم ہوں" ایک ہلکی سی آواز سُنائی دی۔

اختر نے دیکھا وہ اب بھی رو رہی تھی۔

"آخر کچھ تو بتائیں آپ۔ انسان انسان کا ہمدرد ہے۔ شاید میں آپ کے کچھ کام آسکوں۔"

"نہیں نہیں۔ انسان انسان کا قاتل ہے۔ ہمدرد نہیں۔ آپ مہربانی کر کے مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔ مجھ سے کچھ نہ پوچھیں۔" لڑکی نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا۔

"لیکن محترمہ۔ دنیا میں ہر طرح کے انسان بستے ہیں۔ ضروری نہیں کہ پانچوں انگلیاں یکساں ہوں۔"

"ٹھیک ہو گا۔ مگر میں نے دیکھ لیا ہے۔ دنیا میں انسان نہیں بستے۔ انسانی لباس میں بھیڑئیے ہیں۔ دنیا کے تمام مرد بھیڑئیے ہیں۔ خونی بھیڑئیے۔ بھولی بھالی عورتوں کو شکار بناتے ہیں اور اُن کی زندگی کو تباہ کر کے نئے شکار کی تلاش کرتے ہیں۔ عورتیں اُن کے لئے کھلونے ہیں۔ جب چاہیں کھیلیں اور جب چاہیں توڑ کر

پھینک دیں۔ میں نے ایک ہی مرد کو دیکھا ہے اور سب کو پہچان گئی ہوں۔"

اب اختر واقعات کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ اُسے تسلّی دینے لگا۔

"آپ درست فرماتی ہیں محترمہ۔ ہمارے ملک میں عورت کی ہستی بے بس اور لاچار ہے۔ سنگ دل مرد اُس کی فطری معصومیت اور سادہ لوحی سے ناجائز فائدہ اُٹھاتے ہیں اور اُس کی مجبوریوں سے کھیلا کرتے ہیں۔ لیکن نہ ہر عورت سادہ لوح ہوتی ہے اور نہ ہر مرد سنگدل ——— واقعی ابتدائے زندگی میں آپ کو ایسے تلخ تجربات کا مشاہدہ ہوا ہو گا کہ آپ سب کو ایک جیسا سمجھنے پر مجبور کئے گئے۔ مگر...... اور سوچئے تو سہی اگر دنیا سے انسانی ہمدردی بالکل نیست نابود ہو چکی ہوتی تو کیا کوئی انسان دوسرے انسان کو دنیا میں زندہ رہنے دیتا؟ آپ کو شاید معلوم نہیں کہ بدی دنیا میں نیکی کا نام قائم رکھنے کے لئے زندہ ہے ——— اور اس طرح قدرت نے اپنے نظام کو برقرار رکھا ہے۔ انسان کی انسانیت یہ بالکل گوارا نہیں کرتی کہ روتی ہوئی آنکھوں کو چھوڑ کر خاموشی سے چل دے۔ میں آپ کے آنسو پونچھنے کی کوشش

کروں گا۔ آپ مجھے اپنا بھائی سمجھیں اور سارا حال سنائیں۔"

اختر کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ سے نعیمہ کے زخمی دل کو ذرا تسکین محسوس ہوئی۔ اُس نے اُسے ایک شریف النفس انسان سمجھنے پر آمادہ کر لیا اور اُس نے وہ سب کچھ کہہ سُنایا جو اُس سے گذرا تھا۔

"افسوس کہ ہمارے بد نصیب ملک میں لاکھوں سادہ لوح عورتیں مردوں کے دامِ فریب میں آکر اپنا سب کچھ اُن پر نثار کر دیتی ہیں۔ اور تمام دنیا کو اُن کے بدلے میں چھوڑ دیتی ہیں۔ لیکن یہ ظالم مرد۔ ...... اُن کا سب کچھ لے کر بھی اور اُن سے سب کچھ چھڑا کر بھی سیر نہیں ہوتے۔ آؤ بہن تم میرے ساتھ چلو۔ میں اُن کو سمجھاؤں گا شاید وہ راہِ راست پر آجائیں۔"

یہ کہہ کر اختر اُس خاتون کو لے کر شہر کی جانب چل دیا۔

رات ابھی زیادہ نہ ہوئی تھی۔ اس وقت اختر سب کچھ بھول چکا تھا۔ اگر اُس کے سامنے کوئی سوال تھا تو یہ کہ دو ٹوٹے ہوئے دلوں کو کیسے ملایا جائے۔ وہ اس خاتون کے ساتھ بے خبر چلا جا رہا تھا کہ اُس کی آواز نے اُسے چونکا دیا۔

"یہ ہے اُس سیٹھ کا مکان جس کی لڑکی کی زندگی سے وہ اب

نیا کھیل کھیلنا چاہتے ہیں"۔

اختر نے غور سے دیکھا تو یہ وہی مکان تھا جس میں اُس کی آرزوئیں پل کر جوان ہوئی تھیں۔ ایک لمحہ کے لئے اختر کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا اور دوسرے لمحے وہ گہری سوچ میں غرق ہو گیا۔

"کیوں اب ٹھہر کیوں گئے؟"

خاتون کی آواز نے اُسے چونکا دیا۔

"میں اس مکان کے اندر جاؤں گا۔ آپ بھی آئیے"۔ اور وہ خاتون حیرانگی کی نظروں سے اُسے دیکھتی ہوئی اُس کے ساتھ ہو لی۔

"اختر!! اختر تم آ گئے؟"

ایک میٹھی مگر بے قرار آواز نے اُس کا تعاقب کیا اور وہ بول اُٹھا۔

"حمیدہ" ———

دو بچھڑے ہوئے دلوں کے آپس میں ملنے کے لئے بازو بے اختیاری میں اُٹھنے لگے مگر گرد و پیش کو دیکھ کر اُٹھ نہ سکے اور اُن کی چمکتی ہوئی آنکھیں ایک دوسرے سے مل کر رہ گئیں۔

"بڑی مدت کے بعد آئے ہو اختر"۔

حمیدہ کے باپ نے ان دونوں کی نظروں کے تار کو توڑتے ہوئے

کہا۔ پیشتر اس کے کہ اختر کچھ جواب دیتا۔ اُسے ایک اور آواز دروازے کی جانب سے سُنائی دی۔

"ہیلو اختر! یہاں کیسے آ ٹپکے؟"

ایسے الفاظ اُن کی زبان سے نکلتے ہیں جو دل میں رقابت لئے ہوئے ہوں اور اختر نے دیکھا کہ اسلم نشۂ شراب میں مخمور اُس کی طرف بڑھا آ رہا تھا۔ گو اُس وقت اسلم کی حالت قابلِ نفرت تھی مگر نیک دل انسان کسی کی بُرائیوں کو دیکھ کر بھی اُس سے نفرت نہیں کرتے اُن کی بلند نظری کی روشنی میں دوسروں کی سیاہ دلی بھی اُن کے دل میں کسی انسان کے لئے نفرت نہیں ہونے دیتی۔ وہ سمجھتے ہیں کہ سب انسان ایک خدا کی مخلوق ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ تقریباً ہر انسان میں نیک ضمیر موجود ہوتا ہے جسے اگر اُبھارا جائے تو سیاہ دلوں میں بھی روشنی پیدا ہو سکتی ہے۔ اختر کے جذبات ذرا بھی نہ بھڑکے لیکن اُس نے کچھ سوچتے ہوئے اسلم کے سوال کا جواب دیا۔

"آپ کی کرتوتوں کا کچّا چٹھہ بیان کرنے"

"میری کرتوتوں کا! ہا ہا ہا!! یہ منہ اور مسور کی دال؟"

لیکن اختر نے بھی دامنِ ضبط ہاتھ سے نہ چھوڑا۔

"بہت کھیل کھیل چکے اسلم —— کیا ایک زندگی لوٹ کر سیر

نہیں ہوئے؟؟ ——— تم انسان ہو اسلم! اور انسان کو کبھی یہ اجازت نہیں دی جاسکتی کہ وہ بھونرا بن کر کلی کلی کا رس چوستا پھرے۔ انسان کو انسان کی مانند رہنا پڑے گا اسلم۔ ہوش میں آؤ ———"

"کیا بکتے ہو؟" نشہ میں اسلم نے کہا۔ لیکن پھر بھی اختر نے تحمل سے کام لیا۔

"میں بکتا نہیں ہوں اسلم ——— حقیقت بیان کر رہا ہوں۔ مجھ کو تمہیں راہِ راست پر لانے کے لئے خود تمہارے پاس پہنچنا تھا۔ اچھا ہوا کہ تم یہیں آگئے۔ کیا تم نے اپنا یہی شیوہ بنا رکھا ہے کہ بھولی بھالی معصوم عورتوں کو سبز باغ دکھا کر اور زندگی بھر کے پیمان کر کے جب اُن کی جوانی کو لوٹ کر سیر ہو جاتے ہو تو اُنہیں ٹھوکریں مار کر باہر نکال دیتے ہو؟"

"کون کہتا ہے باہر نکال دیا؟ کسے باہر نکال دیا؟" اسلم کچھ ہوش میں آ رہا تھا۔

"جان بوجھ کر انجان نہ بنو اسلم ——— اِدھر آؤ بہن ——— دیکھو اسلم یہ کون ہے؟ پہچانتے ہو اِسے؟ آج یہ تصویرِ بیکسی ہے شاید ایک ہی لمحے میں اِسے بھول جانے کی کوشش کرو۔ مگر اسلم یہ وہی بے کس ہستی ہے جس نے تمہارے چکموں میں آ کر اپنا مذہب

ماں باپ، بہن، بھائی سب تمہاری محبّت کی خاطر چھوڑ دئیے۔ دیکھو اس نے تمہارے لئے کیا کیا؟ اور تم نے اس کے لئے کیا کیا؟ اِس نے تمام دنیا کو اپنے سے بیگانہ بنایا اور تمہیں اپنایا۔ اگر اُس نے اپنی دنیا سمجھا تو تمہیں۔ اپنی زندگی سمجھا تو تمہیں۔ آج سے کچھ عرصہ پہلے تم بھی تو اُس پر جان دیتے تھے۔ کیا آج اس کی زندگی کو موت کے مُنہ میں دھکیلتے ہوئے تمہیں رحم نہیں آتا؟"

نعیمہ کی آنکھیں رو رو کر سُرخ ہو چکی تھیں۔ لیکن وہ اب بھی رو رہی تھی۔ حمیدہ اور اُس کا باپ کبھی ترحم انگیز نظروں سے اُس بھولے شکار کو دیکھتے تھے اور کبھی نفرت انگیز نظروں سے اسلم کی طرف۔ جس کی آنکھیں ایک ایسے مجرم کی طرح جُھک چکی تھیں۔ جو عین چوری کرتا ہؤا پکڑا گیا ہو۔ اور اپنے فعل پر شرمندہ ہو رہا ہو۔ اختر برابر کہے جا رہا تھا۔

"مرد کی آنکھیں ہی ہیں کہ گرگٹ کی طرح رنگ بدلا کرتی ہیں۔ عورت کی نظریں ہیں کہ ایک ہی کو محبّت کی نگاہ سے دیکھتی ہیں۔ اور پھر وہ اُسی کی ہو لیتی ہے۔ تم تو اسلم اُس کی محبّت سے سیر ہو چکے۔ تم نے تو اُسے ٹھوکریں مار کر نکال دیا۔ تمہارا کچھ نہیں بگڑا لیکن بتاؤ وہ غریب کہاں جائے؟ اپنی تمام دنیا تم پر نثار

کر چکی ہے۔ معصوم زندگیاں تباہ کرنے سے تمہیں کیا حاصل ہوگا اسلم؟ آخر یہ لہو و لعب کب تک جاری رہے گا؟ تم قدرت کا سب سے زبردست گناہ کر رہے ہو۔ قدرت کا انتقام زبردست ہوتا ہے اسلم۔ قدرت کے انتقام سے ڈرو۔ کیا تمہارے سینے میں پتھّر کا دل ہے؟ مظلوم کی آہوں سے تو عرش بھی ہل جاتے ہیں۔ کیا تم کچھ بھی محسوس نہیں کرتے؟"

اختر کی تقریر موثر ثابت ہو رہی تھی۔ اسلم کا تمام نشہ ہرن ہو چکا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے ——— پشیمانی اور ندامت سے اُس نے اپنا مُنہ چھپا لیا۔

"میں نے بُرا کیا نعیمہ مجھے معاف کر دو"

گذرے ہوئے افسانے نعیمہ اور اسلم کی آنکھوں کے سامنے تھے۔ اختر کی باتوں نے دونوں کے دل موم کر دئے اور اُنہوں نے پھر اپنے دلوں میں ایک دوسرے کے لئے محبّت محسوس کی ......

حمیدہ اور اُس کے باپ کی آنکھوں میں بھی خوشی کے آنسو ڈھلک آئے اور وہ مستحسن نگاہوں سے اختر کی طرف دیکھنے لگے۔

"تم نے میرے دل کی تاریکی کو روشنی میں بدل دیا اختر بھائی"

تمہارا احسان نہ بھولوں گا۔"

اسلم نے نیچی نظروں سے اختر کی طرف مخاطب ہو کر کہا اور اُس نے جواب دیا۔

"میں بھی تمہارا احسانمند ہوں اسلم کہ تم نے میری نصیحت کو قبول کیا۔ میرے لئے اس سے زیادہ اور کیا خوش قسمتی ہو سکتی ہے کہ دو ٹوٹے ہوئے دل آپس میں مل گئے۔ جاؤ اب ہنسی خوشی رہو۔ ہماری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔"

وہ دونوں رخصت ہوئے۔ اختر اور حمیدہ کی آنکھیں ایکدفعہ پھر ملیں۔ چمکیں۔ لبوں نے کچھ کہنا چاہا لیکن حمیدہ کے باپ کی موجودگی کے خیال سے ساکت رہے۔

"میں اندھا تھا اختر۔ تم نے مجھے غار میں گرنے سے بچا لیا۔"

یہ الفاظ اُس زبان سے نکلے تھے جس نے ایک سال پہلے اختر کو نکمّا اور بے فکرا کہہ کر پکارا تھا۔

اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ ایک ۔۔۔۔۔۔ دو ۔۔۔۔ ۔۔ تین دن گذر گئے۔ جب اختر واپس جانے کی تیاری کرتا حمیدہ کی اشکوں بھری آنکھیں اُس کا راستہ روک لیتیں۔ اور کبھی

اُس کے باپ کا اصرار اُسے واپسی سے باز رکھتا۔ سیٹھ جی نے مسلسل خطوط لکھے مگر اختر معذرت کے ساتھ کچھ دیر اور ٹھہرنے کی التجا لکھ بھیجتا۔

زمانۂ ماضی پھر اپنے قصّے دُہرا رہا تھا۔ گذشتہ جذبات جو ایک سال کے زمانے میں واقعات کی رفتار نے اپنے دُھندلے بادلوں کے نیچے چھپا لئے تھے۔ اب پھر نمودار ہو رہے تھے۔ حمیدہ کی دلنوازیاں پھر اختر کو لُبھا رہی تھیں اور وہ ایک ایسے مسافر کی مانند رہ گیا تھا جس کے پاؤں دو کشتیوں میں ہوں۔ ادہر حمیدہ کی محبّت تھی جو ان دونوں کی عمروں کے ساتھ ساتھ بڑھتی گئی تھی۔ اُدہر سیٹھ جی کے بے پناہ احسانات تھے اور سلیمہ کی دلداریاں۔ وہ سوچتا۔ بہت سوچتا...... خیالات بڑھتے جاتے...... لیکن کسی منزل پہ نہ پہنچتے۔ اُس کی فطرت نہ کسی کے احسانات کو فراموش کر سکتی تھی اور نہ کسی کے محبّت بھرے دل کو توڑ سکتی تھی۔ وہ کچھ بھی فیصلہ نہ کر سکا۔ حتّٰی کہ تین مہینے گذر گئے اور ایک دن سیٹھ جی کا ضروری تار آگیا کہ فوراً پہنچو۔

"اب مجھے جانا ہو گا" اختر نے کہا۔

اور حمیدہ کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ اُسے محسوس ہؤا کہ کوئی اُسے میٹھے خواب سے جھنجھوڑ کر جگا رہا ہے۔ وہ کچھ نہ کہہ سکی لیکن اُس کے آنسوؤں نے سب کچھ کہہ دیا اور اختر کی حساس طبیعت نے سب کچھ سُن لیا۔ ایک دفعہ پھر اختر کے جذبات میں جنگ ہوئی اور.......دو دن کے بعد الہ آباد کی سڑکوں پر تھا۔

رات ہو چکی تھی۔ ابھی اختر نے بنگلے میں قدم رکھا ہی تھا کہ دو سائے اُسے باغیچے کے اندر جاتے دکھائی دئے۔ اختر ایک جھاڑی کی اوٹ میں کھڑا ہو گیا۔ دونوں سائے بنچ پر بیٹھ گئے۔ اور اختر اُن کی باتیں سُن رہا تھا۔

"میں اُس وقت بھی سب کچھ جانتی تھی۔ لیکن یہ نہ جانتی تھی۔ کہ تمہاری بے قراریاں یہاں تک بڑھ جائیں گی۔ ...... مگر اب میں مجبور ہو چکی ہوں ساجد —— میری زندگی کا مالک کوئی اور ہے۔ میں بالکل مجبور ہوں!"

"آہ سلیمہ۔ کاش تمہارے سینے میں بھی دل ہوتا!"

"میرے سینے میں دل ہے۔ اور دل میں محبت کرنے والے کی قدر ہے۔ مگر ساجد! .... والدین کی خواہش اور میرے

اپنے قول مجھے کسی دوسرے کے سپرد کردیں گے۔ تم کیا جانو... ...تمہاری بے لوث محبّت نے آج میرے دل میں بھی یہ خواہش پیدا کردی ہے کہ کاش میں تمہیں اپنا سکتی۔ مگر تم ہی بتاؤ کہ دل کیا کرے؟"

"وہ کون بیداد گر ہے سلیمہ جو میری دنیا کو مجھ سے چھین لیگا۔ ......مجھے بتاؤ وہ کون ہے؟ میں اُس کے پاؤں پڑوں گا۔ ہاتھ جوڑوں گا۔ فریاد کروں گا۔ میری آہیں اُسے مجبور کردیں گی سلیمہ......میرے آنسو اُسے......"

اختر سُنتا رہا۔ سوچتا رہا اور سمجھتا رہا۔ حتّیٰ کہ اُس نے دل کو تھام لیا اور کسی مضبوط ارادے سے دبے پاؤں باغیچے سے باہر نکلا اور خاموشی سے سلیمہ کے کمرے میں داخل ہوگیا۔ وہ اُس کی میز پر بیٹھ گیا۔ قلم کو پکڑ کر پھر سوچنے لگا اور تھوڑی دیر بعد اُس کا قلم کاغذ پر چل رہا تھا۔

"سلیمہ!

طبیعت گوارا نہیں کرتی کہ میری وجہ سے کسی کو دُکھ ہو۔ آج سے تمہیں بہن کہتا ہوں۔ ہنسی خوشی رہو اور بے لوث محبّت کرنے والے کی قدر کرو۔ میں واپس جارہا ہوں۔ سیٹھ جی

کو سلام کہہ دینا۔ زندگی رہی تو کبھی پھر ملیں گے۔

تمہارا بھائی اختر"

اُس نے کاغذ کو لفافہ میں بند کیا۔ لفافہ میز پر رکھا اور اُنہی قدموں سے واپس چلا آیا۔

اس واقعہ کو چھ ماہ گذر چکے ہیں۔ کانپور کے ایک محلّہ میں چاروں طرف روشنی ہی روشنی ہے —— دو دھڑکتے ہوئے دلوں کو ملانے کا انتظام ہو رہا ہے۔ ادہر آتشبازی چل رہی ہے بچے نظریں اُٹھائے دیکھ رہے ہیں۔ پھلجھڑیاں۔ چکّر۔ انار اور رنگارنگ کی روشنی آنکھوں میں چکاچوند پیدا کر رہی ہے۔ خوشی کے شادیانے بج رہے ہیں۔ باجے والوں کی آوازوں سے کانوں پڑی آواز سُنائی نہیں دیتی۔ محتاج اور غرباء بھی آج خوش نظر آ رہے ہیں۔ اُن کی جھولیاں بھی بھری ہوئی ہیں۔ مکان کے اندر مہمانوں کی بھرمار ہے۔ دولھا میاں زنانخانے میں داخل ہو رہے ہیں۔

"اِن کے مُنہ سے سہرا اُٹھائیے تو ذرا۔" یہ سلیمہ کی آواز تھی۔

"آہاہاہا۔ ڈھونڈ لیا ہے نا ہم نے اپنے بھگوڑے

بھیا کو۔"

اختر کی آنکھوں میں مُسکراہٹ نمودار ہوئی اور پیشتر اس کے کہ وہ کچھ کہتا۔ کسی نے اُس کے زور سے چٹکی بھری اور وہ اوئی" کہہ کر چلّا اُٹھا۔

سب طرف سے قہقہے بلند ہوئے اور اختر نے دیکھا کہ نعیمہ اُس کے سامنے کھڑی ہنس رہی تھی۔

"بھائی جان مزاج تو اچھے ہیں۔"

اختر نے اپنے ماحول کا جائزہ لیا۔ سب کے چہروں پر مسرت کی روشنی چمک رہی تھی۔ آج اُس کا اپنا دل بھی روشن تھا۔ اور دنیا کی تمام مسرتوں سے معمور ؛

ایثار

لاہور کی سڑکیں ہیں کہ خدا کی پناہ۔ مخلوق کے اژدہام ہیں کہ چاروں طرف سے بڑھتے ہی چلے آرہے ہیں۔ ٹانگہ والوں کی آوازوں۔ موٹر اور لاری والوں کے ہارنوں سے کانوں پڑی آواز سُنائی نہیں دیتی۔ جو پیدل ہیں وہ پٹڑی پر جارہے ہیں سائیکل والے کے لئے تو بڑی مصیبت ہے۔ جو بہت مشّاق ہوتے ہیں وہ تو اس طرح نکل جاتے ہیں جیسے گولی کانوں کے پاس سے سنسناتی ہوئی گذر جاتی ہے لیکن کسی نو آموز یا نووارد کے لئے سائیکل تو کجا پیدل چل کر بخیریت گھر پہنچ جانا بھی بڑی غنیمت ہے۔ سریندر کو لاہور آئے ابھی تھوڑا ہی عرصہ ہوا تھا اور آج پہلی دفعہ سینما کا شوق اُسے میکلوڈ روڈ کی رنگین فضاؤں میں کھینچ لایا تھا۔

چوراہے میں ایک سرے پر کامریڈ پریم کھڑے ہوئے اپنے دیس کی حالت کا جائزہ لے رہے تھے۔ تہذیب نو کے دلدادہ لوگ مرد اور عورتیں بیشتر انگریزیت میں ملبوس۔ اپنی حقیقت کو فراموش کئے ہوئے۔ اپنے غریب و نادار بھائیوں کی طرف نظرِ حقارت سے دیکھتے ہوئے چشمِ عیاش کی سیری کے لئے اِدھر سے اُدھر ٹہل رہے تھے۔ کامریڈ پریم کو اُن کی بے حسی پر رحم آرہا تھا۔ محض چند لمحے کی حسین فضا میں گذار کر اپنے دل کو جھوٹی تسکین دینے والے۔ سینما، کلب اور سوسائٹی کے دلدادہ اپنے دوسرے بھائیوں کی غربت و بے چارگی کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ اور اتنا نہیں جانتے کہ آج اُن کے دیس کی کیا حالت ہے۔ اُن کے بھائی کتنے ہیں جو خون پسینہ ایک کرتے ہیں اور شام کو اُن کے بچوں کو خشک روٹی بھی میسّر نہیں آتی۔ کتنے ہیں جن کے بدن بھوک سے سوکھ کر کانٹا ہو رہے ہیں اور آج شام بھی انہیں کھانا نہ مل سکے گا؟ کتنے ہیں جنھیں تن ڈھانکنے کے لئے کپڑا بھی میسّر نہیں۔ اُن کے دیس میں کتنی عفّت مآب دیویاں ہیں جو بھوک سے تنگ آ کر چند ٹکوں کے عوض اپنی عصمت کو بیچ رہی ہیں۔ کتنے معصوم بچے ہیں جن کے چہرے یتیمی اور افلاس کے بھوت نے

مکروہ کر رکھے ہیں۔ اور وہ ایک ایک دروازے پر ٹھوکریں کھاتے نظر آتے ہیں —— آج جنگ کا زمانہ ہے۔ تمام دنیا جنگ کی لپیٹ میں آچکی ہے۔ تمام دنیا مصیبتوں کا شکار ہو رہی ہے۔ ظالم ڈکٹیٹر دنیا پر اپنا سکہ جمانے کے لئے قتل و غارت اور خونریزی کر کے اپنی ہوس پوری کر رہے ہیں۔ لاکھوں عورتیں بیوہ ہو رہی ہیں۔ لاکھوں بچّے یتیم ہو رہے ہیں۔ بوڑھی ماؤں کے سہارے اُن کی آنکھوں سے اوجھل ہو رہے ہیں۔ ہرے بھرے گھرانے، سربفلک عمارتیں، اُونچے اُونچے محل دیکھتے ہی دیکھتے خاک کا ڈھیر ہو رہے ہیں۔ اور جہاں سے کل قہقہوں کی آوازیں آتی تھیں وہاں آج رونے والا بھی کوئی نظر نہیں آتا۔ کس قدر عبرت کا مقام ہے۔ آج بنگال کی حالت دیکھو قیامت کا سماں ہے، تڑپتی ہوئی لاشیں راستوں میں پڑی ہیں اور اُن کے لئے خوراک کا ایک دانہ بھی نہیں۔ فاقہ کش مائیں بلکتے ہوئے بچّوں کو چھاتیوں سے چمٹا رہی ہیں مگر مسلسل فاقوں نے اُن کی چھاتیوں میں دودھ کا ایک قطرہ بھی نہیں چھوڑا —— اُف کس قدر قہر ہے؟ خدا کی خدائی میں یہ اندھیرے —— اک قیامت بپا ہے۔ دل والوں کے رونگٹے کھڑے

ہو جاتے ہیں مگر ہمارے نوجوان ہیں کہ اُن کے کانوں پر جوں تک بھی نہیں رینگتی۔ انہیں دنیا کے دُکھ اور درد کا کچھ احساس نہیں۔ اپنے رُوتے اور تڑپتے ہوئے بھائیوں کے آنسوؤں اور آہوں سے بے خبر وہ رنگ رلیاں منانے میں محو ہیں ——— کاش یہ کبھی ------"

اوہ ——— کامریڈ انہی خیالات میں مستغرق کھڑے تھے کہ کوئی چیز اچانک اُن سے ٹکرائی اور اُن کے خیالات کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ وہ گرتے گرتے سنبھلے۔ اُنہوں نے دیکھا کہ ایک کار نہایت تیزی سے اُن کے پاس سے گزر گئی۔ اور ایک سائیکل اُن کے پاس آکر گری یکدم کچھ شور بلند ہوُا۔ اور آن کی آن میں سڑک پر ایک ہجوم اکٹھا ہو گیا۔ کامریڈ بڑھے اور ہجوم کے درمیان ایک نوجوان دیکھا جس کے سر سے خون بہ رہا تھا۔ یہ نوجوان سریندر تھا۔

(۲)

کامریڈ پریم ملک کے اُن سپوتوں میں سے تھے جن کے دل انسانوں کو دکھ میں دیکھ کر تڑپ اُٹھتے ہیں۔ کامریڈ نے اُسی وقت اپنا رومال پھاڑ کر سریندر کے سر پر پٹی باندھی۔ اُسے ٹانگہ میں بٹھایا۔ سائیکل کو بھی ٹانگہ میں رکھا اور ہسپتال پہنچا۔ ضرب شدید تھی۔ سریندر راستے میں بیہوش ہو گیا تھا۔ اُسے ہسپتال میں داخل کر دیا گیا۔

کامریڈ نے جو کچھ کیا انسانی ہمدردی کو مدنظر رکھتے ہوئے کیا۔ اُس نے آج پہلی دفعہ سریندر کو دیکھا تھا۔ تاہم اُس کی فراخ پیشانی پر اُسے ایک چمکتی ہوئی روشنی اور وضع قطع سے سادگی نظر آ رہی تھی اور وہ اُس کی جاذبیت میں کھو رہا تھا۔ وہ اُس سے بالکل ناواقف تھا۔ ہسپتال پہنچنے کے بعد پہلا خیال اُسے سریندر کے گھر کا آیا۔ لیکن وہ اُس کے متعلق کچھ نہیں جانتا تھا۔ کچھ پریشان سا ہُوا مگر پھر سوچ کر اُس کی جیب کو ٹٹولا۔ سیاہ رنگ کا ایک چرمی بٹوا اور اُس پر ایک کارڈ تھا۔ کامریڈ نے پڑھا۔

"سریندر ناتھ بی۔اے۔ 78 شالیمار روڈ۔ لاہور"

کامریڈ نے جھٹ ایک ٹانگہ لیا اور تھوڑی دیر بعد سریندر کے

بنگلہ میں پہنچ گیا۔ سریندر کا والد اور اُس کے دو چھوٹے بھائی اُس وقت کھانا کھا کر ٹہلنے کے لیئے بنگلہ سے باہر جا رہے تھے۔ کامریڈ نے انہیں اس حادثہ کی خبر سُنائی۔ سریندر کا والد متفکر لیکن متشکرانہ نگاہوں سے کامریڈ کو دیکھتے ہوئے اُس کے ساتھ ہو لیا۔ نریندر اور مہندر چلا اٹھے کہ ہم بھی ساتھ جائیں گے۔ باپ نے بہتیرا سمجھایا لیکن وہ بھلا کب ماننے والے تھے۔ وہ بضد ہوئے۔ مہندر کی عمر مشکل سے چار یا پانچ سال کی تھی لیکن وہ بلا کا فہیم تھا۔ وہ کامریڈ کی ٹانگوں سے لپٹ گیا اور نریندر نے جس کی عمر چودہ پندرہ برس کی تھی کامریڈ کا ہاتھ پکڑ لیا اور اس طرح یہ چاروں ٹانگے میں بیٹھ کر ہسپتال پہنچے۔ سریندر کو ہوش آچکا تھا۔ اُس نے چمکتی ہوئی ضعیف آنکھوں سے اپنے محسن کو کچھ ایسی محبت بھری نگاہوں سے دیکھا جس سے کامریڈ کو آج تک واسطہ نہ پڑا تھا اور کامریڈ نے محسوس کیا کہ اُس کی روح کو آج عرصہ کے بعد کچھ شانتی نصیب ہوئی ہے۔

ہسپتال میں مہندر اُس کی گود میں بیٹھا رہا۔ نریندر اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کھڑا رہا اور سیٹھ جی اُس کے سامنے کی کرسی پر بیٹھے رہے۔ کچھ ایسا ماحول پیدا ہوا کہ اجنبیت

کا خیال تک سب کے دل سے نکل گیا اور ایسا معلوم ہونے لگا جیسے مدتوں کے ساتھی اکٹھے بیٹھے ہیں۔ کامریڈ نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ دیر زیادہ ہو چکی تھی۔ اُس نے جانا چاہا اور سب نے تشکر آمیز الفاظ اور نگاہوں سے اُسے رخصت کیا۔

---

(۳)

کامریڈ پریم ایک غریب گھرانے کا چشم وچراغ تھا۔ تھوڑی ہی عمر میں اُس کے والدین پرلوک سدھار چکے تھے۔ بچپن کے زمانہ سے ہی اُسے لتا سے محبّت تھی اور وہ ایک دوسرے سے پیمان کر چکے تھے۔ لتا کے والدین اُس کی شادی کامریڈ سے کرنے پر رضامند نہ تھے کیونکہ وہ غریب تھا اور بالکل بے سرو سامان تھا۔ لیکن لتا اور پریم ایک دوسرے کو اپنا بنا چکے تھے۔ جب لتا نے اپنے والدین کو نارضامند دیکھا تو اُن کی خواہش کے خلاف وہ کامریڈ کے پاس چلی آئی اور وہ دونوں میاں بیوی کے طور سے رہنے لگے۔ کامریڈ کا کوئی تھا ہی نہیں اور لتا پریم کی محبّت میں اپنے تمام رشتہ داروں کو چھوڑ چکی تھی۔ ان دونوں نے اپنی علیحدہ دنیا آباد کی ہوئی تھی۔ ایک دوسرے کی رفاقت میں وہ

دنیا کے تمام رنج و غم بھول چکے تھے اور مسرّت و شادمانی کے جھولوں میں جھول رہے تھے۔ لتا کی محبّت سے کامریڈ کی دنیا آباد تھی لیکن فلک پیر اُن کی خوشیوں کو دو سال سے زیادہ نہ دیکھ سکا۔ لتا پر نمونیہ کا شدید حملہ ہؤا اور وہ کامریڈ کو ہمیشہ کے لئے داغ مفارقت دے گئی۔ بسترِ مرگ پر مرنے سے کچھ عرصہ پہلے وہ زور زور سے رونے لگی۔

"پریم۔ قدرت کے زبردست ہاتھ ہمیں جُدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں"

"ایسا نہ کہو لتا۔ یہ کبھی نہیں ہوگا۔ قدرت اتنی بے رحم نہیں ہے"

"نہیں پریم میرا دل کہہ رہا ہے کہ میں اب تھوڑے ہی دن کی مہمان ہوں"

"یہ کیا کہہ رہی ہو لتا۔ ہم کبھی جُدا نہیں ہو سکتے۔ تمہارے بغیر میں بھی زندہ نہ رہ سکوں گا"

"نہیں نہیں پریم ایسا مت کہو"

"میرا مرن جیون تمہارے ساتھ ہے لتا" اور کامریڈ کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب بہ نکلا۔ وہ لتا کی محبّت میں اپنے آپ کو

کھو چکا تھا۔ اور محسوس کرتا تھا کہ اُس کے بغیر اُس کی دنیا اندھیر ہو جائے گی۔

"تم ابھی جوان ہو پریم! اخلاق اور محبّت کے جوہر تمہارے پاس موجود ہیں۔ سینکڑوں دیویاں تمہارے چرنوں کی داسی بننے کے لئے آمادہ ہوں گی۔ میرا کیا ہے میں تو ایشور کے پاس پہنچ جاؤں گی۔ تم اپنی زندگی برباد نہ کرنا"

لتا کے مُنہ سے یہ الفاظ سُن کر پریم زار و قطار رونے لگا۔

"یہ ہرگز نہیں ہو گا لتا۔ میں صرف تمہارے لئے ہوں۔ یہ کبھی نہ ہو گا کہ تمہارے بعد میں کسی اور کا پتی کہلاؤں"

---

(۴)

لتا کے مرنے کے بعد اُس نے تمام دلچسپیاں ترک کر دیں۔ وہ نوجوان تھا۔ اُس کے سینے میں بھی دل تھا۔ لیکن اُس نے اپنے جذبات کو مٹا کر اپنی زندگی دیس کی بہبودی کے لئے وقف کر دی اور پھر وہ کامریڈ پریم کہلانے لگا۔

سرمایہ داروں کی فرعونیت اور مزدوروں کی بیچارگیاں وہ دیکھتا

تھا اور دل ہی دل میں کُڑھتا تھا۔ یہ بڑی بڑی توندوں والے ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھے رہتے ہیں۔ سیم و زر کے انبار اُن کے پیروں میں ہوتے ہیں لیکن اُن کی حرص و ہوس پھر بھی پوری نہیں ہوتی۔ اُدھر مزدور ہے کہ دن بھر مشقّت کرتا ہے اور شام کو اُسے پیٹ بھر کر کھانا بھی میسّر نہیں ہوتا۔ قدرت اُسے اُتنا ہی دیتی ہے جتنا کہ آنے والی صبح تک وہ خرچ کر دیں۔ اگر کبھی بیمار ہو جائیں تو دوا دارو کے لئے اُن کے پاس کچھ نہیں ہوتا۔ ادھر اُونچے محلوں میں جگمگ کرتے ہوئے گھی کے چراغ جلتے ہیں۔ ادھر ٹوٹی پھوٹی جھونپڑی میں مٹّی کا دیا بھی میسّر نہیں ہے۔ وہ بھی انسان ہیں، یہ بھی انسان ہیں۔ مگر ان میں اتنا تفرقہ کیوں؟ اُدھر قوم کی اندرونی حالت بگڑ چکی ہے۔ چالاک اور عیّار لوگ سیدھے سادے لوگوں کو دھوکا دے کر لیڈری کے روپ میں اپنا اُلّو سیدھا کر رہے ہیں۔ ہندوؤں کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکایا جا رہا ہے۔ مسلمانوں کو ہندوؤں سے متنفّر کیا جا رہا ہے۔ ایک ہی دیس میں رہنے والے۔ ایک ہی دیس کا نمک کھانے والے آپس میں اتنا بگاڑ کیوں رکھتے ہیں۔

اپنی قوم کا نظام اُس کی آنکھوں میں کھٹکتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ایک ہی ضرب سے اُسے توڑ پھوڑ ڈالے مگر بے بس تھا - وہ

محنت کش مزدور بن گیا اور مزدوروں کا حامی - وہ دن رات محنت کرتا - ملک کی خدمت کے لئے - قوم کی بہتری کے لئے - اپنے ضمیر کی آواز پر وہ کام کئے جا رہا تھا - اُس کی تقریروں میں جادو کا اثر پیدا ہو گیا - اُس کی تحریریں مردہ دل مزدوروں میں زندگی کی روح پھونک دیتی تھیں - قوم کے غم میں وہ اپنی خواہشات کو دبا چکا تھا - لنا کی دائمی مفارقت اور ہموطن بھائیوں کے دُکھ اور درد اُسے اجازت نہ دیتے تھے کہ ایک لمحہ بھی وہ شادمانی کا بسر کر سکے ——— کبھی اُس کے چہرے پر مسکراہٹ کے آثار دکھائی نہ دئے تھے - وہ اکثر سوچ میں غرق رہتا - اُس کی عمر بہت کم تھی لیکن تفکرات نے اُس کی شکل کو کچھ ایسا بگاڑ دیا تھا کہ وہ ایک ادھیڑ عمر کا انسان دکھائی دیتا تھا - اُس کی فراخ پیشانی سے تدبر ٹپکتا تھا - نوجوانوں کی سی کوئی بات اُس میں نہ تھی - نہ دل لگی، نہ قہقہے، نہ محفل، نہ رنگینیاں اور نہ حسن و شباب ———

(۵)

ہسپتال سے آکر کامریڈ نے سونے کی کوشش کی، لیکن رات کافی دیر تک اُسے نیند نہ آئی ——— گذشتہ واقعات ایک ایک کرکے اُس کی آنکھوں کے سامنے سے گذر رہے تھے۔ سریندر۔ نریندر۔ مہندر۔ سیٹھ جی سب اُس کو یاد آر ہے تھے اور وہ اپنے آپ کو اُسی ماحول میں دیکھنا چاہتا تھا ———

صبح وہ کافی دیر سے اُٹھا اور کچھ غیر اختیاری جذبہ کے ماتحت وہ سیدھا ہسپتال پہنچا۔ ہسپتال پہنچ کر ابھی وہ کمرے میں داخل نہیں ہُوا تھا کہ مہندر دوڑتا ہُوا آیا۔ اور "بھائی آگئے" کہہ کر اُس کے سینے سے چمٹ گیا ———

کامریڈ کا کوئی بہن بھائی نہ تھا اور نہ کوئی نزدیکی رشتہ دار ——— مزدوروں کی چند تعداد اُسے اپنا محبوب رہنما بیشک سمجھتی تھی اور اُس کی عزّت کرتی تھی لیکن اُسے کبھی کسی معصوم کی بھولی باتوں سے۔ یا کسی بھائی کی محبّت بھری نگاہوں سے واسطہ نہ پڑا تھا۔ وہ اِن کیفیات سے قطعاً ناآشنا تھا۔ جو بے غرض اور بے لوث نظروں میں ملا کرتی ہے۔ کامریڈ نے

اپنے سینے میں ایک مدھم سی لطیف چمک محسوس کی اور کچھ لمحوں کے لئے وہ کیف و مسرّت میں کھو گیا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی وہ سریندر کے پلنگ کی طرف بڑھا اور اُسی دم گلابی رنگ کا ایک ڈوپٹا سرکتا ہوُا اُس کے پاس سے گذر گیا ——

...... وہ اپنی حرکت پر کچھ نادم سا ہوُا کہ بغیر اطلاع دئے کمرے میں داخل ہوگیا۔ سریندر تکیہ کے سہارے پلنگ پر نیم دراز سا پڑا تھا۔ کامریڈ کو دیکھ کر ایک ہلکی سی مسکراہٹ اس کے چہرے پر نمودار ہوئی۔

"آ گئے بھیّا؟" سریندر نے نحیف آواز سے کہا۔

"ہاں۔ اب آپ کی طبیعت کا کیا حال ہے؟"

کامریڈ نے پاس ہی پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"اچھّا ہو جاؤں گا بھائی"۔ سریندر نے اس کی طرف خاموش نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا اور پھر وہ کسی گہری سوچ میں غرق ہوگیا۔

"کیا سوچ رہے ہو سریندر؟ چُپ کیوں ہوگئے؟" کچھ لمحہ کی خاموشی کے بعد کامریڈ بولا

"کچھ نہیں۔ بس یونہی"۔

"نہیں کوئی بات تو ہے جو سوچ رہے ہو"

سریندر مسکرایا۔ اُس کی آنکھوں میں ایک چمک پیدا ہوئی اور اُس نے کہا۔

"میں سوچ رہا ہوں کہ اس کدورت بھری دنیا میں بھی بعض کتنے اچھے آدمی ہوتے ہیں جن کے سینے میں دل اور دل انسانی ہمدردی کے لطیف جذبات سے منوّر ہوتے ہیں۔ اور جو دوسروں کے درد کو اپنا درد سمجھتے ہیں"۔

"بھائی اب گھر کب چلیں گے؟"

معصوم مہندر کے ان توتلے الفاظ سے اُن کا سلسلہ کلام منقطع ہو گیا اور کامریڈ تھوڑی دیر کی اجازت لے کر باہر چلا گیا۔

---

(۶)

"آخر ابھی کتنی دیر انہیں اور یہاں رہنا ہوگا ڈاکٹر؟ کیا ہم انہیں گھر نہیں لیجا سکتے؟"

ڈاکٹر اکیلا بیٹھا کچھ مطالعہ کر رہا تھا۔ جب کامریڈ نے اچانک اُس کے کمرے میں داخل ہو کر یہ سوال کیا ——

"آپ اتنی جلد بازی سے کام کیوں لینے لگے؟ ابھی کل ہی تو اُسے داخل کیا گیا ہے۔ سر کی ضرب شدید ہے۔ خون بہت زیادہ بہ چکا ہے۔ ایسے حوادث میں تو زندگی کا بھی خطرہ ہوتا ہے۔ ابھی انہیں بہت دیر زیر علاج رہنا ہوگا۔" ڈاکٹر نے لاپروائی سے جواب دیا۔

"زندگی کا خطرہ؟ ایشور کے لئے ایسا نہ کہو ڈاکٹر۔ کیا سچ مچ اُس کی زندگی خطرے میں ہے؟" کامریڈ نے نہایت گھبرائی ہوئی آواز سے ڈاکٹر سے دریافت کیا۔

"ہاں میں بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ خون کی کمی کے باعث جس کی زندگی خطرے میں ہو سکتی ہے۔"

ڈاکٹر نے قدرے متانت سے کہا۔

"لیکن آپ ڈاکٹر ہیں۔ اِس کا اُپائے بھی تو ہو سکتا ہے۔"

"ہاں ہو سکتا ہے لیکن اُس کے لئے ایک عرصہ درکار ہے۔ مریض کے کسی عزیز کا خون شاید مریض کے خون کی کمی پوری کرنے کے لئے مطلوب ہو۔"

کچھ سوچنے کے بغیر ہی کامریڈ نے استفسار کیا۔

"تو کیا میں اپنا خون اس غرض کے لئے پیش نہیں کر سکتا؟"

"آپ؟ لیکن آپ تو بہت کمزور دکھائی دیتے ہیں اور ہمیں

مریض کے رشتہ داروں میں سے کسی کا خون چاہیئے ۔"

ڈاکٹر نے اُسے سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے کہا۔

مریض کے رشتہ دار ؟ سیٹھ جی ، مہندر ، نریندر اور وہ ۔ ۔ ۔

معصوم دوشیزہ سرلا ۔ چاروں اُس کی آنکھوں کے سامنے پھر گئے اور وہ چلّا اُٹھا۔

"یہ کبھی نہیں ہو سکتا ڈاکٹر۔ اُن میں سے کوئی بھی خون دینے کے قابل نہیں ہے ۔ کیا میں اُن کے کسی کام نہ آسکوں گا ؟"

"ہاں شاید ٹیسٹ کرنے کے بعد آپ کے خون کے جراثیم اگر مریض کے خون کے موافق ہوں تو آپ کا خون بھی کام آسکے گا ۔"

"ہاں ڈاکٹر ضرور ایسا کرو ۔ لیکن اتنی مہربانی اور کرنا کہ اُن میں سے کسی کو بھی اِس بات کی خبر نہ ہو کہ خون میں نے دیا ہے ۔"

کامریڈ نے کچھ سوچتے ہوئے سنجیدگی سے التجا کی اور ڈاکٹر اُس کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے خون ٹیسٹ کرنے کی تیاری کرنے لگا۔

---

(۷)

سریندر کا محبت بھرا دل ۔ مہندر کی بھولی باتیں ۔ نریندر کا معصوم چہرہ ۔ سیٹھ جی کی شفقت آلود آنکھیں اور وہ .... جسے غلطی سے اُس نے دیکھ لیا تھا ــــــ کامریڈ کو خیال آیا کہ اُن میں سے کسی کا دکھ وہ کسی صورت میں برداشت نہیں کر سکے گا کسی غیر اختیاری جذبہ نے اُس کے دل میں یہ خواہش پیدا کر دی کہ خواہ اُس کی جان چلی جائے ۔ سریندر بچ جائے ۔ وہ سریندر کی زندگی کو اپنی زندگی سمجھنے لگا اور پھر ......اُس نے اُس کے لئے اپنی زندگی پیش کر دی ــــــ

اُس کے بعد .... ایک عرصہ تک وہ خود چارپائی سے اُٹھ نہ سکا ۔ کبھی اُن کی جُدائی اُس کو بے قرار کرنے لگتی ۔ وہ کسی ارادہ کو لئے ہوئے اُٹھتا لیکن کچھ خیال آنے پر پھر دراز ہو جاتا ۔

کامریڈ اُن انسانوں میں سے تھے جو کسی سے کچھ نیکی کرنے کے بعد اُسے چھپانے کی کوشش کیا کرتے ہیں ۔ وہ بالکل نہیں چاہتا تھا کہ سریندر کو یا دوسروں کو اس بات کا احساس ہو کہ اُس نے اُن کے لئے کچھ کیا ہے اور اسی لئے وہ کچھ عرصہ تک باوجود بے قراری کے وہاں جا نہ سکا ۔

دن گذرتے گئے ...... سریندر صحتیاب ہوگیا اور وہ سب اپنے گھر چلے گئے۔ لیکن کامریڈ کی یاد اُن کے دل سے نہ گئی۔ اُس کی بے لوث ہمدردی، اخلاق اور شرافت ان سب کے دل پر گہرا اثر کر چکی تھی۔ اُس کا یکایک غائب ہو جانا اُن کے لئے باعث حیرانگی ضرور تھا۔ تاہم قدرت نے اُن کے دل میں اُس کے لئے روحانی محبّت کے جذبات پیدا کر دئے تھے۔ کامریڈ کی یاد اُن سب کے دل میں جاگزیں ہو چکی تھی۔ لیکن افسوس کہ وہ اُس کے متعلق کچھ نہیں جانتے تھے۔ وہ اُسے ملنا چاہتے تھے لیکن اُسے کہاں سے تلاش کیا جائے؟ ایک تو وہ نووارد تھے اور دوسرے لاہور جیسا گنجان آباد شہر جس میں لاکھوں نفوس بستے ہوں کسی ناواقف کو ڈھونڈ لینا ناممکن تھا۔

---

(۸)

کچھ وقت اور بیت گیا اور کامریڈ اپنی اصلی حالت پر واپس آ گئے۔ وہ ایک دفعہ اُن کو دیکھنا چاہتے تھے۔ اُن کی طبیعت بیتاب تھی اُن کی معصومیت سے لطف اندوز ہونے کے

لئے ـــــ لیکن ..... اتنے عرصے کے بعد وہ کیسے اُن سے مل سکے گا۔ وہ سوچتا..... جذبات کے ہجوم مین مَیں بالکل بھول چکا ہوں کہ وہ میرے لئے اجنبی ہیں اور میں اُن کے لئے اجنبی ہوں۔ میں نے جو کچھ کیا اپنے ضمیر کی آواز پر کیا اور خاموشی سے کیا ـــــ وہ بالکل نہیں جانتے کہ میں نے اُن کے لئے کیا کیا۔ تو اس صورت میں یہ کیسے ممکن ہے کہ میری یاد اب بھی اُن کے دل میں موجود ہو ـــــ وہ کبھی کے مجھے بھلا چکے ہوں گے ـــــ

کبھی سریندر کی محبوب نظریں اُس کی آنکھوں کے سامنے آتیں۔ کبھی مہندر کی معصوم باتیں اُس کے کانوں سے ٹکراتیں۔ اور اُس کا دل پکار اُٹھتا۔

"یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ وہ مجھے بھول جائیں۔"

پھر اُسے خیال آتا۔

"لیکن اگر وہ مجھے بالکل بھول چکے ہوں تو اس میں کون سی عجیب بات ہو گی، دو دن کی ایک ہنگامی ملاقات ـــــ گذشتہ تمام واقعات ایک ایک کر کے اُس کی آنکھوں کے سامنے سے گذر جاتے اور دن بھر اسی سوچ و بچار میں وہ زندگی کی ایک

ایک شام کھو دیتا۔

---

(۹)

تھوڑے دن اور گذر گئے۔ کامریڈ کی تمام سرگرمیاں موقوف ہو چکی تھیں ——— وہ محسوس کرتا کہ اس کے سینے میں ایک خفیہ جنگ چھڑ چکی ہے۔ اور وہ اس سے نبرد آزما ہے۔ یوں ہی اُس کی طبیعت پریشان رہتی۔ وہ سوچتا کہ آخر یہ پریشانیاں کیوں؟ وہ معلوم کرنے کی کوشش کرتا کہ وہ کیا چاہتا ہے لیکن اُسے کچھ بھی حاصل نہ ہوتا۔ سوائے اس کے کہ چند تصورات اور زیادہ مضبوطی سے اس کے دل و دماغ پر منقش ہو گئے اور وہ اس طرح اُن تصورات سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کرنے لگا جس طرح کوئی پرندہ قفس سے نکلنے کے لئے پھڑپھڑاتا ہے مگر اُس نے اپنے آپ کو مجبور پایا۔

ایک دن وہ انارکلی بازار سے گذر رہا تھا کہ اُس کے کانوں میں کسی معصوم کی کچھ ایسی مانوس آواز سنائی دی جس سے وہ آشنا معلوم ہوتا تھا۔ اُس نے بائیں طرف نگاہ دوڑائی

اور اُس کا دل فرطِ مسرّت سے چمک اُٹھا۔ سریندر، مہندر اور سرلا ایک دوکان پر کھڑے کچھ خرید رہے تھے۔ کامریڈ اُن کی طرف بڑھنے لگا کہ دفعتاً کسی خیال سے رُک گیا۔ وہ وہیں کھڑا رہا اور سوچنے لگا کہ آیا مجھے اُن سے ملنا چاہیئے یا نہیں۔ اچانک مہندر نے پیچھے کی طرف دیکھا اور بھائی، بھائی چلّاتا ہؤا بھاگ کر کامریڈ سے لپٹ گیا۔ سریندر بھی آگیا اور سرلا بھی اور اُس کے بعد مہندر اور سریندر نے اُس پر سوالات کی بوچھاڑ کردی۔

"بھائی تم کہاں چلے گئے تھے؟"

"بھائی۔ تم نے تو کہا تھا میں ابھی آتا ہوں۔"

"کب سے راہ تک رہے ہیں آپ کی۔"

"آپ نے ہمیں بھول جانے کی کوشش کی ہوگی۔"

"بھائی میں نے تمہیں بہت ڈھونڈا!"

"پتاجی آپ کو بہت یاد کرتے ہیں۔"

"اور دیدی بھی!"

آخری لفظ مہندر معصوم کی توتلی زبان سے نکلے تھے۔ کامریڈ کچھ جھینپ سے گئے۔ سریندر مسکرایا اور سرلا نے شرم

سے آنکھیں جھکالیں۔ اور پھر وہ سب کامریڈ کو لے کر اپنے بنگلے پر چلے گئے ـــــ

---

(۱۰)

جب کہ کامریڈ بالکل نا امید ہو چکا تھا۔ اور اُن کے خیال کو دل سے نکال لینے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک ایسے واقعہ کے اچانک ظہور نے جسے وہ قرین از قیاس سمجھ چکا تھا۔ اُسے ایک ایسی دنیا میں پہنچا دیا جہاں وہ سب کچھ حتیّٰ کہ اپنا آپ تک بھول گیا۔ مسرّتوں کا ایک طوفان اُس کے سینے میں مچلنے لگا اور اسی عالم میں وہ سب بنگلے میں پہنچے۔ سیٹھ جی کامریڈ کو دیکھتے ہی بڑے تپاک سے ملے۔

"بیٹا۔ کہاں رہے اتنا عرصہ؟ ہماری تو آنکھیں بھی تھک گئیں تمہاری راہ تکتے تکتے ـــــ"

جتنی باتیں وہ سُن رہا تھا کامریڈ کے لئے انوکھی تھیں۔ اس بھری دنیا میں بھی وہ یکہ و تنہا تھا اور آج تک ایسی محبت سے دوچار نہ ہوا تھا۔ فرطِ مسرّت سے اُس کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔

"سرلا بیٹی جاؤ۔ تم چلئے تیّار کراؤ ان کے لئے۔"

اور سرلا مسکراتی ہوئی اپنے اُسی گلابی رنگ کے دوپٹے کو سکیڑتی ہوئی دوسرے کمرے میں چلی گئی ——

وہ سب بیٹھے رہے۔ اسی طرح ...... مہندر کامریڈ کی گود میں۔ نریندر اُس کے شانے کے ساتھ اور سریندر اور سیٹھ سامنے کی کرسی پر۔ کچھ دیر باتیں ہوئیں اور اتنے میں سرلا چائے لے آئی ——

کامریڈ کی نظریں اچانک سرلا کی طرف اٹھیں۔ وہ اپنے مرمریں ہاتھوں سے چائے بنانے میں مصروف تھی۔ کامریڈ نے اُس کی آنکھوں کی طرف دیکھا۔ کس قدر معصومیت اور مسرت ٹپک رہی تھی اُس کی آنکھوں سے ...... وہ کتنی خوش دکھائی دے رہی تھی۔ جیسے غیر فانی دولت حاصل ہوئی ہو۔ دفعتاً سرلا نے آنکھیں اٹھائیں اور کامریڈ کی نظروں کو اپنی طرف متوجہ دیکھ کر اُس کی نظریں ٹھٹک گئیں۔ ایک ہی لمحہ کے لئے۔ اور .....

"آپ بھی تو چائے پئیں ہمارے ساتھ۔" کامریڈ نے بغیر کچھ سوچے سمجھے کہہ دیا۔ وہ کچھ محجوب سی ہو کر جانے لگی۔

"آؤ بیٹی۔ بیٹھو۔ تم بھی چائے پی لو۔"

سیٹھ جی نے مسکراتے ہوئے کہا اور سرلا اُس کے ساتھ کی

کرسی پر بیٹھ گئی۔

وہ سب چائے پینے لگے اور پھر باتیں کرنے لگے۔ مگر کامریڈ ہاں۔ ہوں کے سوا کچھ بول نہ سکا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ اُس کے جذبات کا ہجوم آج اُس کی قوت گویائی پر غالب آچکا ہے۔ شب کو کافی دیر ہوگئی۔ اور کامریڈ بمشکل اُن سے اجازت لے کر چلنے لگے۔ مہندر پھر اُسے چمٹ گیا۔

"پھر کب آؤ گے بھیّا؟"

"جب کہو۔" کامریڈ نے کہا۔

"تم نہ جاؤ بھیّا۔ یہیں رہو۔" مہندر نے بھولے پن سے کہا۔

"نہیں بھائی۔ ایسا تو نہیں نا ہو سکتا۔"

کامریڈ نے اُسے گلے سے بھینچتے ہوئے جواب دیا۔

"تو پھر کل ضرور آؤ۔" مہندر نے جلدی سے کہا۔

"اچھّا کوشش کروں گا۔" کامریڈ نے لطف لیتے ہوئے چڑانے کے لئے کہا۔ اور مہندر اُوں اُوں کرنے لگا۔

"مجھ سے وعدہ کرو۔ ورنہ میں نہیں جانے دوں گا۔"

وہ سب کھل کھلا کر ہنس پڑے۔

"اچھا میں وعدہ کرتا ہوں، کل ضرور آؤں گا بس۔" اور پھر

کامریڈ وہاں سے چل دئیے۔

بنگلے سے باہر نکل کر وہ کافی دور جا چکا تھا کہ اتفاقاً اُس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ بنگلے کے دروازے پر سرلا کھڑی اُسے دیکھ رہی تھی۔ جب اُس نے کامریڈ کو اودھر دیکھتے پایا تو وہ بھاگ کر بنگلے کے اندر چلی گئی۔

کامریڈ دل ہی دل میں مسکرائے اور آج کے واقعات پر غور کرنے لگے۔

---

(۱۱)

دن گذرتے گئے۔ اب ہر دن کامریڈ کے لئے پیغامِ مسرت لے کر آتا تھا۔ کچھ رومانوی کیفیات میں وہ اس طرح کھو گیا کہ قومی سرگرمیاں وہ بالکل بھول گیا۔ اُس کی دنیا۔۔۔۔۔۔ ایک چھوٹی سی حسین اور محبّت بھری دنیا میں محدود ہو کر رہ گئی۔ کامریڈ اور سرمیندر کے دل آپس میں کچھ اس طرح ملتے چلے گئے کہ ایک دن ایسا آیا جب اُنہوں نے محسوس کیا کہ ایک دوسرے کے بغیر وہ زندہ نہیں رہ سکتے۔ وہ حقیقی معنوں میں دوست بن گئے اور اُن کی ہستیاں ایک دوسرے

کے لئے لازم وملزوم بن گئیں۔

ایک دن سریندر۔ مہندر۔ سرلا اور کامریڈ چاروں اکٹھے بیٹھے چائے پی رہے تھے اور آپس میں خوش گپیاں ہانک رہے تھے۔ سیٹھ جی بھی مسکراتے ہوئے اُن میں آ بیٹھے۔

"کیا ہی اچھا ہو اگر چاروں ہمیشہ ایسے ہی رہیں"

اُن کے مُنہ سے بے ساختہ نکل گیا۔ سیٹھ جی کے اس فقرہ کی تہ میں ایک لطیف اور پاکیزہ خواہش تھی۔ سب نے یہ سُنا مہندر۔ سریندر اور سرلا کے چہرے مسکرا اُٹھے۔ کامریڈ نے سیٹھ جی کے ان الفاظ کی اہمیت کو سمجھا۔ کامریڈ نے سرلا کی طرف دیکھا اور سرلا نے اُس کی طرف۔ دونوں نے کچھ سمجھنے کی کوشش کی۔ اُن کی آنکھیں دفعتاً جُھک گئیں اور کامریڈ کے خیالات ایک نئے دور میں گذرنے لگے۔

---

(۱۲)

"ایشور کرے کہ ہماری دوستی اور محبت ہمیشہ قائم رہے۔"
سریندر نے ایک دن کامریڈ کی موجودگی میں آسمان کی طرف نظریں اٹھاتے ہوئے کہا۔ اور کامریڈ کا چہرہ فرطِ مسرت سے چمک اُٹھا۔

"ہم سب یہ چاہتے ہیں کہ آپ سے تعلقات اس قدر مضبوط کر لئے جائیں کہ اِس زندگی میں وہ ٹوٹ نہ سکیں۔"
سریندر نے بات کو جاری رکھا۔

"تو کیا اس میں کوئی شک ہے۔" کامریڈ نے مسکراتے ہوئے کہا ——

"نہیں بھائی۔ تم نہیں سمجھتے۔ وہ ہمیں ایک ایسے رشتہ میں منسلک کر دینا چاہتے ہیں جو ہمیشہ کے لئے ہماری دوستی اور محبت کا نشان باقی رکھے۔"
سریندر نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے نہایت سنجیدگی سے کہا۔

"دیدی - دیدی بھائی آگئے؟"

کمرے کے دروازے کی چوکھٹ پر کھڑے ہوئے مہندر دوسرے کمرے کی طرف مُنہ کرتے ہوئے چلّایا۔

"تو پھر میں کیا کروں؟"

"خود ہی تو ابھی یاد کر رہی تھیں۔ اور اب کہتی ہیں میں کیا کروں۔"

مہندر بھولے پن سے بولا ——

"دیکھو پریم! ایک ایک کے دل میں تمہاری یاد بس چکی ہے۔ کیا تم یہ نہیں چاہتے کہ ہم ہمیشہ اکٹھے رہیں۔"

کامریڈ گہرے خیالات میں غرق تھا۔

"کیا تم اب بھی کچھ نہیں سمجھے پریم۔"

کامریڈ بدستور خاموش تھا۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے اُس کی مرحوم بیوی کی تصویر تھی ...... وفا، معصومیت اور محبّت کی دیوی، لتا —— کیا اُس کے بعد کسی اور سے محبّت کا حق مجھے پہنچتا ہے؟ —— اُس کی موت سے کچھ پیشتر کا وقت اُس کی آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔

"سینکڑوں دیویاں تمہارے چرنوں کی داسی بننے کے لئے آمادہ ہوں گی پریم ...... یہ ہرگز نہ ہوگا لتا کہ تمہارے

بعد میں کسی اور کا پتی کہلاؤں .... یہ ہرگز نہ ہو گا کہ تمہارے بعد میں کسی اور کا پتی کہلاؤں .... یہ ہرگز نہ ہو گا لتا ...."

توپ کے گولوں کی طرح کامریڈ کے دماغ پر اُس کے اپنے الفاظ بار بار ٹکرانے لگے۔ وچن .... وچن .... مرحوم لتا کی روح کیا کہے گی؟ میں اُسے وچن دے چکا ہوں ..... یہ نہیں ہو سکتا۔ میں کبھی شادی نہیں کر سکتا۔"

سینما کی تصویروں کی طرح ایک ایک منظر باری باری اُسے نظر آنے لگا۔

بچپن کا زمانہ، لتا کی محبّت، اُس کی جوان موت، وچن اور پھر سریندر ...... ہسپتال، ڈاکٹر، خون، مہندر۔ نریندر۔ سرلا ——

اب اُس کے خیالات بدل رہے تھے۔

"اُف! میں بھولتا جا رہا ہوں ...... میں سب کچھ بھول رہا ہوں ...... میں لتا کی محبّت کو بھول رہا ہوں۔ .... میں مزدور بھائیوں کی خدمت کو بھول رہا ہوں۔

——— ایک وقت تھا کہ دن رات میں ملک اور قوم کی بہتری کے لئے وقف کرچکا تھا۔ آج چند ہنگامی واقعات نے مجھے اس قدر بیہوش کردیا ہے کہ میں سب کچھ بھول چکا ہوں۔ مجھے کیا ہوگیا ہے؟ ......میں کیا ہوتا جا رہا ہوں؟ ....

اب جذبات کا دوسرا پہلو کامریڈ کے سامنے تھا۔ کسی مستقل ارادے کے ساتھ وہ وہاں سے چلا آیا۔

---

(۱۳)

"آج ایک ہفتہ ہونے کو آیا۔ پریم نہیں آئے"۔ سریندر نے غمگین لہجے میں کہا۔

"کیا بھیّا ہم سے ناراض ہوگئے ہیں؟" مہندر نے معصوم نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"سریندر بھائی تم نے کوئی بات تو نہیں کی جو اُن کی ناراضگی کا باعث ہوئی ہو؟"

سرلا نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔ اور سریندر اُس کی طرف

دیکھ کر خاموش ہو گیا۔

"کیا بھیّا اب نہ آئیں گے۔" سریندر نے کہا۔

"آخر بات کیا ہوئی تھی جو اُس دن وہ ایک دم چلے گئے؟" سیٹھ جی نے متفکرانہ انداز سے پوچھا۔

"ایسی تو کوئی بات نہیں ہوئی۔" سریندر نے کہا۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ اُس نے اُسے کیا کہا تھا۔ وہ سوچنے لگا۔

——— ہم نے ہمیشہ پریم کی خوشی کو مدنظر رکھا۔ ہمارے دن کس قدر ہنسی خوشی سے گذر رہے تھے۔ آخر کامریڈ ناراض کیوں ہو گئے؟ وہ ہماری باتوں کا جواب دئے بغیر کیوں چلے گئے؟ اور پھر یکایک غائب کیوں ہو گئے؟ ایک تو وہ دن تھے جب دن رات ایک دوسرے کے بغیر رہنا مشکل نظر آتا تھا۔ آج اس قدر انقلاب کیوں؟

اگر کامریڈ واقعی ہمارے ساتھ خوش تھے۔ تو کیا اُن کا فرض نہ تھا کہ ہماری خواہش کی تکمیل میں خوشی محسوس کرتے۔ اُن کے لئے اس میں بُرا بھی کیا تھا؟ اُنہیں اپنے آپ کو خوش قسمت خیال کرنا چاہیئے تھا۔ لیکن وہ یکدم مُنہ کیوں موڑ گئے .... اِن ہی خیالات میں سریندر

پریشان تھا ــــــ

---

(۱۴)

کامریڈ اب پھر اپنے مزدور بھائیوں میں کھڑے اپنی تقریروں سے اُن کے مردہ دلوں میں جوشِ عمل پیدا کر رہے تھے۔ اُن کی قومی سرگرمیاں اب پھر زوروں پر تھیں۔ اُن کی آواز میں اب پہلے سے زیادہ درد تھا۔ اُن کی باتوں میں پہلے سے زیادہ سوز تھا۔ وہ کبھی تنہائی میں بیٹھتا تو اُس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے۔ سریندر اور سرلا۔۔۔ ۔۔۔۔کسی خیال کے اچانک آجانے سے اُس کا دل درد سے بھر اُٹھتا۔۔۔۔۔۔۔ وہ اُن سے بالکل قطع تعلق کر چکا ہے۔۔۔۔۔۔۔ اُن کے دل کو کتنی زبردست ٹھوکر لگی ہوگی۔ لیکن۔۔۔۔۔۔۔وہ مجبور تھا۔۔۔۔۔۔۔ کاش کہ وہ اُن کی خوشی کے لئے کچھ کر سکتا ــــــ اُس کی زندگی کی پُر اندوہ داستان میں ایک بابِ جمیل کا اضافہ ہوتے ہوتے رہ گیا۔۔۔۔۔۔۔چند ہنگامی واقعات سیاہ داغ

چھوڑ گئے ہیں۔ جو عمر بھر اُس کے سینے سے مٹ نہ سکیں گے۔ اُس کا دل روتا ہے۔ وہ اُنہیں دیکھنے کے لئے تڑپتا ہے لیکن وہ اپنے احساسات اور اپنی خواہشات پر صبر کر رہا ہے۔ کیا یہ ایثار نہیں +

بنسری

گاؤں کی صبح کا سہانا سماں۔ بہار کا خوش گوار موسم تھا۔ ایسے معلوم دیتا تھا جیسے قادرِ مطلق کی تخلیق کردہ تمام خوب صورتیاں سمٹ کر اس مختصر سے وقت میں سما گئی ہیں۔ بادِ نسیم کے ہلکے ہلکے جھونکے کھیتوں اور درختوں سے اٹھکھیلیاں کرتے ہوئے اپنے نازک کندھوں پر بہار کی دلفریب خوشبوؤں کو اُٹھائے ہوئے ترنگ بھرے دلوں کی اُمنگیں بیدار کر رہے تھے۔ اُبھرے ہوئے سورج کی سنہری کرنیں مستی کے جھومتے ہوئے درختوں کے سبز پتّوں پر پڑ کر یوں دمک رہی تھیں جیسے کسی نے شیش محل میں چراغ رکھ دیا ہو —— ہر طرف خوشی ناچ رہی تھی۔ بچّے خوش تھے۔ جوانوں کی جوانی مست تھی اور بوڑھوں کے جُھرّیوں سے بھرے ہوئے چہرے مسرور تھے۔

— گاؤں کی نازک اندام الہڑ دوشیزائیں سروں پر اور پہلوؤں میں پانی کے گھڑے اُٹھائے، سینہ تانے۔ ہوا سے اُڑتے ہوئے آنچل سنبھالے ایک دوسرے سے چھیڑ چھاڑ اور نقرئی قہقہوں سے فضا میں ترنم پیدا کرتی ہوئی کنوئیں سے پانی لینے آرہی تھیں ان میں پیکرِ حسن و جمال اندرا بھی تھی —— دفعتاً اُس کے کانوں میں بنسری کے خوش گوار نغمے۔ روح کو تڑپا دینے والے نغمے..... سوز و گداز سے بھرپور نغمے گونجنے لگے ——

نہ معلوم اُس آواز میں کیا جادو تھا جس نے اندرا کو مست و بیخود بنا دیا۔ اُس کی جوان روح تڑپ اُٹھی اور اُس کے قدم بے قرار ہو کر اس کی تلاش کرنے لگے جس نے فضا میں ترنّم پیدا کر رکھا تھا۔ جس کی لے پر کائنات کا ذرّہ ذرّہ رقص کر رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بھگوان کرشن ایک دفعہ پھر اس دکھیا سنسار کو پیغام مسرت دینے کے لئے تشریف لے آئے ہیں —— کون تھا جو ایسے میں مست و بیخود نہ ہو جاتا۔

—— اس نغمے کی مقناطیسی کشش اندرا کو اس ٹیلے پر کھینچ لائی جس پر ایک غریب چرواہا دل میں مسرتوں کی دنیا اور ہاتھ میں بلنسری لئے ہوئے میٹھی تانوں سے ذرّہ ذرّہ کو وجد

میں لا رہا تھا۔ ایک نوجوان کو اچانک دیکھ کر اندرا کے پاؤں رُک گئے اور وہ مبہوت سی کھڑی رہ گئی ——— نوجوان نے بنسری چھوڑ کر آنے والے کی طرف دیکھا۔ پریم دیوتا تاک میں تھا۔ اِدھر دونوں کی نگاہیں چار ہوئیں اُدھر اس نے ایک ایسا کاری تیر چلایا کہ دونوں کے دلوں میں پیوست ہو گیا۔ یہ طلسم ٹوٹا اور سرور آگیں کیفیت کے بعد ایک دفعہ پھر سکوت چھا گیا۔

اندرا نے اپنے ہوش و حواس بجا کیے اور جلدی سے واپس لوٹی۔ لیکن اُس کے کان ابھی تک بنسری کے رس بھرے نغموں سے گونج رہے تھے ——— اُس کی نگاہوں میں ابھی تک نوجوان چرواہے کا تصوّر تھا ——— آہ وہ کتنا سُندر ہے .... اور اُس کی بنسری کے نغمے ——— اندرا کا معصوم دل جسے ابھی تک دنیا کی آلائشوں نے چھوا تک نہیں تھا۔ آج میٹھا میٹھا درد محسوس کر رہا تھا۔ مگر ایسا کیوں؟ وہ سوچ رہی تھی "کیا بنسری کا ایک نغمہ کسی کی دنیا بدل سکتا ہے؟" انہی خیالات میں کھوئی ہوئی وہ کنوئیں پر آئی۔ بمشکل پانی بھرا اور گھر کا رُخ کیا۔

۲

غریب پردیسی کمار۔ اگرچہ اُس کے چہرے پر غربت و افلاس کے آثار نمایاں تھے لیکن اُس کے جسم میں زندگی اور زندگی میں روحِ رقصاں تھی۔ اُس کے سینے میں دل اور دل میں تڑپ تھی —— لیکن ...... وہ آج سے قبل ایک بے کیف زندگی بسر کر رہا تھا۔ اُس کی دنیا ...... قدرت کی رنگینیوں کے مشاہدات اور اُس کی جان سے زیادہ عزیز بنسری کے کیف و سرور تک ہی محدود تھی۔ اُسے معلوم دیتا تھا کہ اُس کی زندگی واقعی بے کیف بسر ہو رہی ہے۔ غربت و ناداری اُس کے لیئے کوئی بار نہ تھی۔ لیکن ...... وہ محسوس کرتا تھا کہ اُس کی دنیا میں ایک بہت بڑی کمی ہے۔ وہ ...... ابھی تک حسن کی رنگینیوں اور جوانی کی تڑپ سے ناآشنا تھا۔ اُس کی زندگی رومان آفریں کیفیتوں سے بے خبر تھی۔ لیکن آج وہ کچھ محسوس کر رہا تھا۔ کسی کی مدبھری آنکھیں اور نازوں بھری جوانی اُس کے تصورات میں چھا چکی تھی۔ کسی کی حسین یاد اُس کے خیالات کی دنیا میں بس چکی تھی۔ اور بیخودی میں جھوم رہا تھا۔ اُسے محسوس ہؤا کہ ایک لطیف روشنی اُس کے سینے میں چمک

رہی ہے ۔

وہ ایک عالم سرور میں کھو گیا ۔ اور تھوڑی دیر کے بعد اُس کے دل میں حسین ارمان انگڑائیاں لے رہے تھے ——

---

(۴)

دوسرے دن ...... حسرتوں کو پہلو میں دبائے ہوئے پھر سورج نکلنے سے پہلے ہی ٹیلے پر جا بیٹھا ۔ اس نے فضائی سکوت کو توڑا اور بنسری کے سُریلے نغمے گونجنے لگے اور دنیا کا ایک ایک ذرہ وجد میں آکر رقص کرنے لگا ——

کمار گاؤں کی طرف ٹکٹکی لگائے بیٹھا تھا ۔ اُس کی نگاہوں نے دیکھا کہ اندرا نے گھڑا کنوئیں پر رکھا اور کشاں کشاں ٹیلے کی طرف آ رہی ہے ....

کیا بنسری کے ایک نغمے میں اتنا جادو بھی ہو سکتا ہے ....

اندرا دنیا و مافیہا سے بے خبر اس نغمے کی طرف چلی آ رہی تھی ۔ کہ اچانک ایک درخت سے ٹکرائی اور گر پڑی ۔ کمار نے جلدی سے بنسری چھوڑی اور ٹیلے سے نیچے اُترا ۔ اندرا کے حواس کچھ

لمحوں کے لئے کھو چکے تھے۔ کمار نے جلدی سے بکری کا دودھ اپنے مٹی کے پیالے میں لیا۔ اندرا کے حلق میں ٹپکایا اور اُس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا —— وہ کسی اور ہی دنیا میں پہنچ گیا۔ اُس کا تخیّل اُسے کہیں سے کہیں لے گیا۔ اُس کے تصوّرات کی دنیا ایک حسین پھلواڑی کی شکل میں محدود ہو کر رہ گئی جس میں گلہائے رنگا رنگ اپنی اپنی نو خیز جوانیوں پر اترائے ہوئے مسکرا رہے تھے۔ اُس کے خوابیدہ ارمان مچلنے لگے۔ اور وہ بے اختیار ہو کر اُن کلیوں سے کھیلنے لگا کہ اچانک ایک ہلکی سی آواز نے اُسے چونکا دیا —— اندرا کا سر اُس کی گود میں نہیں تھا —— ایک دفعہ پھر نگاہیں چار ہوئیں —— دونوں خاموش تھے لیکن اُن کی نظریں سب کچھ کہہ گئیں۔ خاموشی ہی میں سب عہد و پیمان ہو گئے۔ اُن کے لبوں کی خفیف سی مسکراہٹ بھی اس خاموشی کا ساتھ دے رہی تھی ——

ایک غیر اختیاری جذبہ کے ماتحت کمار نے بیخود ہو کر اپنے ہاتھ پھیلا دئے۔ اندرا اُس سے لپٹ گئی۔ کمار جھکا اور اُس کے پھول سے نازک لبوں پر محبت کی پہلی مُہر ثبت کر دی۔

---

(۴)

زمانہ گذرتا گیا اور ساتھ ساتھ اندرا اور کمار کی محبّت بھی روبہ ترقی رہی - وہ روز و شب ایک دوسرے کے لئے بے چین رہنے لگے - اُن کی رات صبح کے انتظار میں محوِ خواب رہتی اور ہر آنے والی صبح اُن کی محبّت کی تجدید کا ایک پیغام لے کر آتی —— بوڑھا وقت آنکھوں پر پٹی باندھے ہوئے بغیر کچھ سوچے سمجھے دو دلوں کے بیکس ارمانوں کو نظر انداز کئے ہوئے لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اپنی دیرینہ چال چلا جا رہا تھا - اندرا اور کمار کی محبّت ایک غیر فانی جذبہ کی صورت اختیار کر چکی تھی - وہ چاہتے تھے کہ ایک لمحہ بھی ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں لیکن قضا و قدر کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ دونوں کی نظریں مستقبل کی طرف تھیں - وہ محسوس کرتے تھے کہ اُن کی زندگی ایک دوسرے کے بغیر موت ہے —— عشق اور مشک کا چھپا رہنا ...... ذرا ناممکن سی چیز ہے - دو دلوں کے مہکنے سے ایک خوشبو پیدا ہوئی جو دور تک پھیلتی چلی گئی - اور ایک دن اندرا کے والدین تک بھی جا پہنچی ——

اس رنگین فسانہ کو شروع ہوئے کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا کہ

اندرا کی قسمت نزدیکی گاؤں کے ایک متموّل زمیندار کے ہاتھ سونپ دینے کا فیصلہ کر دیا گیا ——— اس کا اندازہ کون لگا سکتا ہے کہ اس سے ان دو دلوں پر کیا بیتی۔

---

(۵)

اندرا اور کمار کی ملاقاتیں اب رنجیدہ اور پُر سوز ہوتی تھیں۔ تبسّم اُن کے لئے آہیں بن کر رہ چکا تھا اور وہ ارمانوں کے برباد گلستاں میں بگولا کی مانند آوارگی کا مجسمہ بن چکے تھے۔ اُن کے دل کی دنیا اُس نئے ساز کی مانند تھی جس کے ساز اچانک گرنے سے ٹوٹ جائیں۔ اُن آنکھوں سے جو ایک دوسرے کی محبّت کے جام کے نشہ میں خمار آلود رہ چکی تھیں گرم گرم آنسو ٹپکنے لگے اور وہ سرد آہوں میں کھو کر اسی طرح زندگی کی ایک شام کھو دیتے ———

آنے والا بھیانک وقت اُن کی آنکھوں کے سامنے تھا۔۔ کوئی چارہ اُن کو نظر نہ آتا تھا۔ ہاں ایک علاج تھا جو وہ جانتے تھے لیکن وہ ایسا کرنا نہیں چاہتے تھے۔ اگرچہ اندرا بضد تھی کہ

رنج والم کی اس بستی سے دور کہیں چلے جائیں لیکن کمار کو گوارا نہ تھا کہ معزز گھرانے کی عزّت کو یوں پاؤں تلے روندا جائے۔ وقت کا تیز رفتار گھوڑا آخر اس منزل پر بھی آپہنچا جب کہ اندرا کے بیاہ کی تیاریاں شروع ہوئیں ——

جوشِ محبت شرم وحیا پر غالب آیا اور اندرا نے اپنے والدین کو صاف بتا دیا کہ وہ کبھی اس زمیندار سے شادی نہ کرے گی۔ اور کہ وہ اپنی دنیا کا مالک ایک غریب چرواہے کو بنا چکی ہے۔ لیکن طوطی کی آواز نقّار خانے میں کون سُنتا ہے۔ اس بیکس کی آواز خوفناک دھمکیوں میں دبا دی گئی۔ اور اُس کو گھر کی چاردیواری میں محبوس کر دیا گیا لیکن اندرا جس کے دل میں ایک ہی سودا سما چکا تھا کب خاموش رہ سکتی تھی —— یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ اُس کے دل کی بستی اُجڑ رہی ہو اور وہ ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھی رہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ کسی کے گھر کو آگ لگ رہی ہو اور وہ خاموش بیٹھ کر تماشا دیکھے۔ تاہم وہ وقت کے انتظار میں تھی ——

(۶)

ایک اندھیری شب کو ...... جب کہ دن چڑھتے ہی اندرا کو کسی دوسرے کے ہاتھ سونپا جانا تھا۔ جب ہر طرف سے مایوس ہو کر اُسے کوئی چارہ نظر نہ آیا تو رات کی تاریکی میں گھر والوں کی نظریں بچاتے ہوئے گھر کے در و دیوار کو خیرباد کہا اور وہ ویرانے میں اُس ٹوٹی پھوٹی جھونپڑی میں پہنچی جہاں بدنصیب کمار اپنی آرزوؤں کی مردہ لاش تصوّر میں سامنے لئے ہوئے آنسو بہا رہا تھا ......وہ سر جھکائے اپنے ارمانوں کا خاموش ماتم کر رہا تھا کہ جھونپڑی کا دروازہ کُھلا اور یاس و حسرت کی زندہ تصویر کمار کے سامنے کھڑی تھی۔

وہ چونک اُٹھا "اندرا" ——

"ہاں کمار اب میں اُن دشمنوں کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ آئی ہوں"۔

"اندرا! یہ تم نے کیا کیا اندرا —— میں تو اپنی زندگی برباد کر چکا ہوں۔ تم کیوں اپنی زندگی تباہ کرتی ہو؟ تم نے غلطی کی جو ایسے میں چلی آئیں۔ مجھے بھول جانا تھا اندرا! دنیا تجھے کیا کہے گی —— عیش و آرام کی زندگی چھوڑ کر کیوں دکھ کے کنوئیں میں گرتی ہو —— مجھ سے تمہیں کیا سکھ مل سکے گا اندرا —— ایک ناز و نعم

میں پلی ہوئی لڑکی ایک غریب کے ساتھ کب تک خوش رہ سکے گی۔"
یہ سنتے ہی اندرا کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ محبّت اندھی ہوتی ہے اُس کے لیے غریب اور امیر سب یکساں ہیں۔ جو راحت اندرا کو ایک غریب چرواہے کے قدموں میں مل سکتی تھی وہ زمیندار کی دولت اور شان میں کہاں؟ عورت جب پریم کرنے پر آتی ہے تو اپنا سب کچھ لٹا کر بھی سیر نہیں ہوتی۔ جس کو ایک دفعہ دل دے دیا اُسی کی ہو رہی۔

اندرا نے کہا۔ "یہ تم کیا کہہ رہے ہو کمار۔ عورت صرف ایک بار پریم کرتی ہے۔ میں نے تم سے پریم کیا۔ تمہاری ہوں اور تمہاری رہوں گی ——— جسے تم کانٹے کہتے ہو میرے لیے پھول ہیں پلیتم۔ مجھے مکّار دنیا کے طعنوں کی کچھ پروا نہیں ہے جو سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی نہیں سمجھتی۔ اور سب کچھ سمجھتے ہوئے بھی پروا نہیں کرتی۔ مجھے ان چمکیلے پتھروں کی بھی پروا نہیں جو انسان کا دل اپنی اولاد تک کے لیے پتّھر بنا دیتے ہیں ——— اک تمہارے قدموں میں رہنے کے لیے میں دنیا کی تمام خوشیوں پر لات مارنے کے لیے تیّار ہوں۔ میرے لئے یہ سب ہیچ ہیں کمار ——— اب یہ نہیں

ہو سکتا کہ دولت کے لالچ سے یا دنیا کے طعنوں سے ڈر کر میں اپنا ارادہ بدل دوں - عورت کا فیصلہ بس قطعی فیصلہ ہے - میں ان ظالموں کو ہمیشہ کے لیئے چھوڑ آئی ہوں - چلو کسی ایسی جگہ چلیں، جہاں اُن کی کینہ ور نظریں ہمیں کبھی دیکھ نہ سکیں - اور ایک ایسی بستی بسائیں جس میں تمہارے اور میرے سوا کوئی دوسرا نہ ہو" ــــــ

کمار کے پاس اب کوئی جواب نہ تھا - وہ اندرا کی محبّت میں اپنے آپ کو کھو چکا تھا لیکن اُس کی راحت اور آئندہ زندگی کا سوال اُسے مجبور کر رہا تھا کہ وہ اندرا سے کہے کہ وہ اُسے بھول جائے - لیکن یہ اُس کے بس کا روگ نہیں تھا ــــــ جب اُس نے اندرا کے پائے استقلال میں کوئی لغزش نہ دیکھی تو دونوں ایک طرف کو چل کھڑے ہوئے ــــــ

---

(۷)

ادہر جب صبح ہوئی تو راز طشت از بام ہوا ــــــ پل بھر میں تمام گاؤں میں سنسنی پھیل گئی - شادی سے ایک رات

پیشتر دولہن کا غائب ہو جانا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ اندرا کے والدین کی تو اُن کے خیال میں ناک کٹ گئی۔ گھر میں کہرام مچ گیا اور چاروں طرف آدمی اندرا کی تلاش میں دوڑا دئے گئے۔

---

(۸)

ادہر یہ شمع محبّت کے دو پروانے..... دلوں میں ایک نئی دنیا بسانے کے ارمان لئے ہوئے کسی نامعلوم پگڈنڈی پر قدم اُٹھائے جا رہے تھے کہ راستے میں آندھی اور بارش نے آدبوچا —— یہ درختوں کے ایک جھنڈ میں جان بچانے کی فکر میں تھے کہ بجلی کی کڑک اور بادل کی گرج کے ساتھ ساتھ گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز بھی سُنائی دی اور تھوڑی دیر میں زمیندار کے آدمی ہاتھوں میں لاٹھیاں لئے ہوئے گھوڑوں پر سوار بلائے ناگہانی کی طرح آپہنچے۔ لمبی لمبی لاٹھیاں کمار کی طرف بڑھیں اور چیخ وپکار کی دردناک آواز فضا میں سُنائی دی۔ جی بھر کر کمار پر لاٹھیاں برسائی گئیں اور پھر اُسے مردہ سمجھ کر

اندرا کی آنکھوں کے سامنے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے دریا کی لہروں کے سپرد کر دیا گیا ——

اندرا کی آنکھیں اس منظر کی تاب نہ لاسکیں اور وہ بے ہوش ہو گئی۔ وہ سنگدل اُسے اُٹھا کر اُس کے والدین کے پاس لے گئے۔ وہاں اُس سے کمال سخت دلی کا سلوک کیا گیا۔ اُسے مار پیٹ کر ایک تنگ و تاریک کوٹھری میں بند کر دیا گیا۔ اور کڑی نگرانی کی جانے لگی ——

---

(۹)

کمار کو جب دریا میں پھینکا گیا تو زبردست طوفان باد و باراں موجزن تھا۔ بڑھتی ہوئی لہروں نے اُس پرستارِ محبّت سے کمال مہربانی کا سلوک کیا اور اُسے اپنے سینے پر اُٹھا کر پھر دریا کے کنارے پر ہی پہنچا دیا —— کچھ عرصہ کے بعد طوفان تھما اور فضا میں سکون پیدا ہوا —— رات بھر کمار وہیں بے ہوش پڑا رہا لیکن دوسرے دن جب سورج دیوتا نے اپنے سنہرے پر پھیلائے تو زندگی کی جھلک اُس کے زرد چہرے پر نمودار ہوئی۔

آہستہ آہستہ اُسنے آنکھیں کھول دیں۔ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اور گزشتہ واقعات کا ایک دھندلا سا تصوّر اُس کی آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آندھی۔ طوفان اور لاٹھیاں ــــ لیکن اندرا اُسے نظر نہ آئی۔ اُس نے اٹھنا چاہا لیکن اُسے محسوس ہوا کہ اُس کی طاقت مفقود ہو چکی تھی ــــ پریشانی کے عالم میں وہ چاروں طرف اندرا۔ اندرا چلّایا۔ لیکن سوائے صدائے بازگشت کے اُسے کچھ اور سُنائی نہ دیا۔ اُمید کے گلشن سے اُسنے آرزو کی چند کلیاں حاصل کی تھیں اور وہ بھی مُرجھا گئیں اب اُس کی نا اُمیدی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ کچھ دیر حسرتوں کی سیاہ گود میں وہیں بیٹھا رہا۔ کہ ایک راہ گیر کی مہربانی سے دوچار ہوا۔ جس نے اُسے اپنے گھوڑے کی پیٹھ پر بٹھا کر اُسے اُس کی بوسیدہ جھونپڑی میں پہنچا دیا۔ وہاں اُس نے بکری کا کچھ دودھ پیا تو زندگی کے آثار دکھائی دئے۔ اگرچہ وہ دردوں سے نڈھال ہو رہا تھا۔ لیکن ایک مریضِ محبت بھلا کب چین سے بیٹھ سکتا تھا۔ وہ یہ معلوم کرنے کے لئے سخت بے قرار تھا کہ ان ظالموں نے اندرا سے کیا سلوک کیا ــــ خود تو چلنے پھرنے سے عاری تھا اُس کے ایک چرواہے دوست نے اُس کی مدد کی اور اُسکے سبب

سب کچھ بتا دیا۔ جوشِ محبت نے اُسے عالمِ دیوانگی میں پہنچا دیا تھا طرح طرح کے خوفناک خیالات اُس کے دل میں سما رہے تھے۔ آج سے کچھ دن پہلے ایسے خیالات کے لئے اُس کے دل میں جگہ نہ تھی اور اُس کے ارادے خوفناک نہ تھے۔ لیکن اب وہ اندرا کے حاصل کرنے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دے گا لیکن افسوس کہ وہ بے بس تھا۔

---

(۱۰)

ایک روز جب کہ یاد گذشتہ آہیں بن بن کر اندرا کے کے سینے سے نکل رہی تھی۔ چاند اپنی پوری آب وتاب سے چمک رہا تھا اور دنیا کو منوّر کر رہا تھا مگر اندرا کے لئے وہ بیکسی کی شمع تھی جو گذری ہوئی ناکامیوں کے مزار پر روشنی کر رہی تھی۔ اُس کے تصورات گھر کی چار دیواری کو چیرتے ہوئے بہت دور نکل گئے ـــــ بظاہر اُس کی آنکھیں بند تھیں۔ لیکن وہ دیکھ رہی تھی۔ ایک اندھیری اور ڈراونی شب ...... گھنا جنگل۔ کہیں کہیں درندوں کے چنگھاڑنے کی

آواز۔ کہیں سانپ کی پھنکار ـــــ اک تھکا ماندہ مسافر۔ چہرہ ناکامیوں کی تصویر، دل میں حسرتوں کا طوفان .... بے اختیاری میں چلا جا رہا ہے ...... راستہ خطرناک ہے۔ کہیں آتا ہے کہیں چڑھاؤ ہے ...... وہ کبھی گرتا ہے کبھی سنبھلتا ہے.. ... پیر کانٹوں سے چھلنی، جگر غم سے زخمی، مگر چلا جا رہا ہے ـــــ چاروں طرف اندھیرا ہے مگر اُس کے سینے میں کچھ روشنی ہے ..... اُمید کی روشنی ..... ہائے اُمید .... اک میٹھا خیال لئے چلا جا رہا ہے۔ پاؤں اک پتھر سے ٹکراتا ہے ..... گرتا ہے ..... ہاتھ کانٹوں پر جا پڑتے ہیں۔ تھکن سے چُور ہے۔ طاقت مفقود ہے ـــــ اُٹھنا چاہتا ہے لیکن اُٹھ نہیں سکتا ـــــ اور ..... لیکن وہ پھر اُٹھتا ہے ـــــ اچانک اک ہلکی سی آواز اُس کے کانوں میں پہنچتی ہے ـــــ میرے محبوب، کدھر جا رہے ہو پریمی، تمہارا یہ راستہ تو نہیں۔ اِدھر آؤ پریمی، کب سے راہ تک رہا ہوں تمہاری ... کانٹوں کی دنیا میں کیوں جا رہے پھولوں کی بستی کو چھوڑ کر ـــــ چونک کر پیچھے دیکھتا ہے۔ چاروں طرف نور ہی نور تھا.... میٹھی میٹھی روشنی ..... رنگا رنگ کی روشنی ..... حسین

پھولوں کی دنیا - بھینی بھینی خوشبو، خوشرنگ آسمان، سبز مخملی زمین، ...... دنیا نرالی ...... اک نورانی صورت اُس سے مخاطب تھی، وہ مجسمۂ حسن تھا۔ جسے دیکھ کر اُس کے چہرے پر بشاشت اور دل میں سرور کی ایک کیفیت پیدا ہوئی، دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر چلنے لگے —— گوہرِ مقصود اُسے مل چکا تھا۔ چاروں طرف خوب صورت اور شفّاف پانی کے چشمے تھے، اور درمیان میں پھولوں کی ایک سیج تھی —— دونوں اُس پر بیٹھتے ہیں، ابھی اُن کی آنکھیں چار نہیں ہوئیں، چاہتے ہیں کہ جی بھر کر ایک دوسرے کو دیکھ لیں ...... نگاہیں تمناؤں کو لئے ہوئے اُٹھتی ہیں۔ کہ اچانک خوفناک اور ڈراؤنی آوازیں اُنہیں اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں —— روشنی مدّھم ہونے لگی ..... فضا میں سیاہی چھانے لگی، پھول مُرجھا رہے تھے اور چشمے کا پانی رنگ بدل رہا تھا۔ اتنے میں لمبے لمبے سیاہ پروں والے بڑے بڑے جسم کے خوفناک جانور اُس نورانی صورت کی طرف جھپٹتے ہیں ..... اُس کے مُنہ سے چیخ نکل گئی ——

اندرا اب پھر رنج و محن کی اُسی دنیا میں تھی اور اس کی نگاہوں نے دیکھا کہ چاروں طرف پرانے گھروں کی وہی دیواریں تھیں ——

خواب سے پہلے کی کیفیات پھر اس کے دل میں سما رہی تھیں کہ اُس کے کانوں نے ایک مژدۂ جانفزا سُنا۔ پاس کے ٹیلے سے بنسری کے میٹھے میٹھے مدھم گیت فضا کو خوشگوار بنا رہے تھے ـــــ کمار کے سوا یہ کون ہو سکتا ہے؟ ۔۔۔۔۔۔ یہ اندرا کے دل کی آواز تھی، وہ عالمِ بے اختیاری میں جھومتی ہوئی اُٹھی اور ٹیلے کی طرف جیسے کھینچتی ہی چلی گئی ـــــ سامنے کمار ہاتھ میں بنسری لئے ہوئے میٹھے راگ الاپ رہا تھا، ناگ دیوتا بھی سیر کرتے ہوئے اُدھر آ نکلے۔ راگ کی کشش تھی، وہیں بیٹھ گئے، اور بیخود ہو کر جھومنے لگے ـــــ کمار بے خبر تھا، اندرا کی آنکھوں کے سامنے اُس کا پریمی زندہ موجود تھا، اُس کی مسرّت کی انتہا نہ تھی۔ وہ چلّاتی ہوئی اُس کی طرف دوڑی۔ کمار نے بنسری ہاتھ سے چھوڑ دی اور ہاتھ پھیلائے ہوئے آگے بڑھا۔ جوں ہی یہ دو بچھڑے ہوئے دل آپس میں ملے اندرا نے اچانک ایک خوفناک چیخ ماری اور دوسرے لمحہ وہ فرشِ خاک پر تھی۔ کمار نے دیکھا کہ ایک زہریلا سانپ اندرا کے پاؤں سے لپٹا ہؤا تھا۔ خونِ محبّت نے جوش مارا۔ اُس نے بدحواس ہو کر سانپ کو ہٹانا چاہا لیکن آہ کہہ کر گر پڑا۔

پریم دیوتا خوش تھے کہ لاج رہ گئی۔ حسرت بھری نگاہیں چار ہوئیں، اندرا کا آخری لفظ کمار کے منہ سے نکلا۔ ادھر اندرا کے لبوں کو حرکت ہوئی اور کچھ نامعلوم سی آواز فضا میں سُنائی دی ـــــ

(۱۱)

اب ہر طرف سے سکون و اطمینان تھا۔ اور فضا میں مکمّل خاموشی تھی۔ بھگوان نے سچّے پریم کی لڑی کے دو آبدار موتیوں کو دیکھا اور پھر اُس بنسری کی طرف جس کی وجہ سے ایک پُر حسرت افسانہ پریم دیوتا کے کارناموں میں شامل ہوا۔ بھگوان مسکرائے، بنسری کی ایک ہلکی سی آواز سُنائی دی۔ اور دو پاکیزہ روحوں پر نغموں کی بارش ہو رہی تھی ۰

شیخ برکت علی تاجر کتب و پبلشر نے اپنے علمی پرنٹنگ پریس لاہور میں باہتمام میاں فیروز الدین پرنٹر چھپوا کر کشمیری بازار لاہور سے شائع کیا

تعلیمی جواہرات

اُردو کا قاعدہ (جدید) باتصویر حصہ اوّل	۰ر
اُردو کا قاعدہ (جدید) باتصویر	۱ر
ابتدائی اُردو پرائمر حصہ اوّل	۱ر
ابتدائی اُردو پرائمر حصہ دوم	[illegible]ر۵ پائی
ابتدائی اُردو ریڈر حصہ اوّل	۵ر۹ پائی
ابتدائی اُردو ریڈر حصہ دوم	۰ر
ابتدائی اُردو ریڈر حصہ سوم	۰ر۶ پائی
[illegible] کی پہلی کتاب (جدید)	۲ر۰ پائی
[illegible] دوسری کتاب (جدید)	۳ر۶ پائی
[illegible] کتاب (جدید)	۳ر۶ پائی
[illegible] (مڈل)	۴ر۶ پائی
[illegible] پٹین گرامر	۱۰ر
[illegible] دوسری منزل	۶ر۱ پائی
[illegible] تیسری منزل	۰ر۸ پائی
[illegible]ب کی چوتھی منزل	۰ر۴ پائی
حساب کی پانچویں منزل	۰ر۴ پائی
حساب کی چھٹی منزل	۰ر۱۱ پائی
حساب کی ساتویں منزل	۹ر۲ پائی
حساب کی آٹھویں منزل	۹ر۱ پائی
جدید کاپی سلپ نمبر ۱	۱ر
جدید کاپی سلپ نمبر ۲	۱ر
جدید کاپی سلپ نمبر ۳	۱ر
جدید کاپی سلپ نمبر ۴	۱ر
جدید اٹلس صوبہ پنجاب معہ نقشہ	۲ر۶ پائی
جدید تعلیم النسا کی پہلی کتاب	۳ر
جدید تعلیم النسا کی دوسری کتاب	۴ر
جدید تعلیم النسا کی تیسری کتاب	۶ر
جدید تعلیم النسا کی چوتھی کتاب	۸ر
امدادی شہریت و حفظ صحت	۵ر
امدادی جغرافیہ میٹرکولیشن	۱۰ر۶ پائی
پنجاب کا نیا جغرافیہ	۱۰ر۵ پائی
گولڈن بک آف جیاگریفی اُردو	۸ر
اُردو گرامر جدید حصہ اوّل	۳ر۹ پائی
اُردو گرامر جدید حصہ دوم	۰ر۶ پائی
اُردو گرامر جدید حصہ سوم	۰ر۲ پائی
اُردو گرامر جدید حصہ چہارم	۱۲ر

ملنے کا پتہ

شیخ برکت علی اینڈ سنز تاجران کتب کشمیری بازار لاہور